SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - II

بی۔ اے ۔ پارٹ : سال دوّم

SEMESTER - IV

URDU IDS-II

تاریخ اردو زبان و ادب

TAREEKH-E-URDU ZABAN-O-ADAB

DR. BILQUIS BEGUM

Head Of Department, Urdu

Surendranath College, Kolkata. (West Bengal)

ڈاکٹربلقیس بیگم

صدرشعبہءاردو ۔ سریندرناتھ کالج۔کولکاتہ۔مغربی بنگال

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - II

بی۔ اے۔ پارٹ : سال دوّم

سمیسٹر چھارم

SEMESTER - IV

URDU IDS-II

تاریخ اردو زبان و ادب

TAREEKH-E-URDU ZABAN-O-ADAB

Dr. Bilquis Begum

Head Of Department, Urdu

Surendranath College, Kolkata. (West Bengal)

ڈاکٹر بلقیس بیگم

صدر شعبہء اردو

سریندرناتھ کالج۔کولکاتہ۔مغربی بنگال

بی۔ اے۔ سال دوّم (سمیسٹر چھارم)

TAREEKH-E-URDU ZABAN-O-ADAB

تاریخ اردو زبان و ادب

برایے نصاب

UNIT I: URDU NASAR 1857 KE BAAD (FICTION)

باب 1 :۔ اردو نثر ۱۸۵۷ء کے بعد (فکشن)

اکائی ۱ :۔ اردو نثر ۱۸۵۷ء کے بعد

اکائی ۲ :۔ اردو ناول

اکائی ۳ :۔ اردو افسانہ

UNIT II: URDU NASAR 1857 KE BAAD (GAIR AFSANVI ADAB)

باب 2 :۔ اردو نثر ۱۸۵۷ء کے بعد (غیر افسانوی ادب)

اکائی ۴ :۔ اردو تنقید

اکائی ۵ :۔ اردو ڈرامہ

UNIT III: URDU SHAIRI 1857 KE BAAD

باب 3 :۔ اردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد

اکائی ۶ :۔ اردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد (منتخب اصناف سخن)

اکائی ۷ :۔ اردو غزل گوئی

اکائی ۸ :۔ اردو نظم نگاری

UNIT IV: ADABI TEHRIKAT O RUJHANAT (19 VE SADI ME)

باب 4 :۔ ادبی تحریکات ورجحانات (انیسویں صدی میں)

اکائی ۹ :۔ ادبی تحریکات ورجحانات کا جائزہ (انیسویں صدی میں)

اکائی ۱۰ :۔ علی گڑھ تحریک

اکائی ۱۱ :۔ رومانی تحریک

UNIT V: ADABI TEHRIKAT O RUJHANAT (20 VE SADI ME)

باب5:۔ ادبی تحریکات ورجحانات (بیسویں صدی میں)

اکائی ۱۲ :۔ ترقی پسند تحریک

اکائی ۱۳ :۔ جدیدیت کی تحریک

اکائی ۱ : اردو نثر ۱۸۵۷ء کے بعد

اکائی کے اجزاء

1.1 مقاصد
1.2 تمہید
1.3 موضوعات
1.3.1 اردو ادب کے منتخب نثری اصناف کا جائزہ
1.3.2 ناول
1.3.3 ڈرامہ
1.3.4 افسانہ
1.4 خلاصہ
1.5 نمونے کے امتحانی سوالات
1.6 فہرہنگ
1.7 شفارش کردہ کتابیں

1.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے طلباء۔۔۔
☆ اردو ادب میں نثر کسے کہتے ہیں؟ یہ بتاء سکیں گے۔
☆ اردو ادب کے نثری اصناف سخن کا جائزہ لے سکیں گے۔
☆ اردو ادب میں ۱۸۵۷ء کے بعد ناول، ڈرامہ اور افسانہ سے واقف ہوسکیں گے۔

1.2 تمہید

'سب رس'، وجہی کی پہلی نثری کتاب ہے جو اردو ادب میں نثری آغاز کا سبب بنی سب رس جس کا موضوع مذہبی نہیں ہے۔ جس کا اسلوب ادبی اسلوب میں آتا ہے۔ وجہی سے پہلے اور اس کے بعد کے مذہبی رسائل میں جو تبلیغی مقصد کے تحت یعنی کو عوام تک پہنچانے کے لیے لکھے گئے۔ اردو نثر کے اس سفر میں یہ دور بنیادی طور پر فارسی سے ترجمے کا دور ہے۔ گیارہویں صدی ہجری اور ۱۸۰۰ سے ۱۸۵۷ کی ساری تصانیف فارسی سے ترجمہ یا اخذ کی گئی ہے۔ اور اس کا طرز احساس نہ صرف اردو تہذیب وادب کے گلے کا ہار بن

جاتے ہیں بلکہ برعظیم کا تہذیب اوراس کے ادب کو بھی نیا رنگ ونوراورنئی زندگی عطا کرتے ہیں۔میراجی خدانی،اورمیراں یعقوب ان دونوں بزرگوں نے فارسی تصانیف کواردو کے قالب میں ڈھالا اوراس کے محاوروں،روزمرہ لہجے،اورآہنگ کواردو میں اس طور پرسمویا کہ مذہبی نثر نے بھی منفرد شکل اختیار کرلی۔میراں جی حسین نے خدانما میں سوال و جواب کی شکل میں تصوف کی تشریح کی ہے تو ''کلمُتہ الحقائق'' کے نام سے یہ کتاب ہےاس نثر سے زبان کے ارتقاء کا پتا چلتا ہے میراں یعقوب نے شمائل ''الاشقیا'' یہ نثری کتاب لکھی اورنثر کوآگے بڑھایا ابھی تہذیب سطح پرادبی وعلمی سرگرمیاں جاری تھیں جس طرح کوئی تہذیب اچانک اپنے عروج پرنہیں پہونچ جاتی اس طرح اچانک زوال بھی نہیں ہوتی عروج تہذیبی قوتوں میں ایک وحدت اختیار کرتا ہے۔اسی طرح اردونثر بھی عروج کے منازل طے کرتی گئی۔وجہی نے ''سب رس'' تحریر کرکے اردوادب میں نثر کی بنیاد ڈالی اوراس طرح اردوادب داستان نویسی کا آغاز ہوا۔

1.3 موضوعات

1.3.1 اردوادب کے نثری اصناف کا تعارف

اردوادب میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی منتخب نثر نگاری کا اس اکائی میں جائزہ لیا گیا ہے۔نثر میں ناول نگاری،ڈرامہ نگاری اور افسانہ نگای پرتبصرہ کیا گیا ہے۔

1.3.2 ناول

اردوزبان میں قصے کہانیوں کی روایت بہت پرانی ہے۔اس روایت کوناول کے طرز میں ڈھالنے کا تصورمغربی ادب سے آیا۔ناول اپنے عہد کے مختلف طرح طرح کے انسانی تجربوں کوفنی سلیقے سے پیش کرنے والےفن کا نام ہے۔ناول کافن زندگی کی تصویرکشی ہے۔حقیقت کوتخلیق کا روپ دے کریا تخلیق کوحقیقت کا جامہ پہنا کراس طرح پیش کرنا کہ قصہ کی حیثیت سے اس کے تمام اجزاء میں تال میل اورہم آہنگی قائم ہے ناول ہے۔

فنی اعتبار سے ناول کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ،کردار،مکالمہ منظرنگاری اورنظریہ حیات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ایک کامیاب ناول کے لیےضروری ہے کہ اس کے تمام عناصرواجزاء ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ناول کا قصہ دلچسپ ہواور پلاٹ کےمختلف اجزا خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہوں ناول کے تمام کردارحقیقی زندگی سے قریب تر ہو۔ناول کے مکالمے مصنوعی اور بے جان ہونے کے بجائے فطری مناسب موزوں اوردلچسپ ہوں۔اور پلاٹ کےمختلف اجزاء خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہوں۔ناول کے تمام کردارحقیقی زندگی سے قریب تر ہوں ناول کے مکالمے مصنوعی اور بے جان ہونے کے بجائے فطری ہو۔منظرنگاری کچھ ایسی ہو کہ اس سے کرداروں کی شخصیت اجاگر ہو۔اورمتعلقہ واقعات اورجگہ مکمل تصویر پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے آجائے اورنظریہ حیات کا اظہار بالکل فطری رنگ میں ہو۔ایسا محسوس نہ ہو کہ ناول نگاری قاری پراپنا نقطہ نظر تھوپ رہا ہے۔

1.3.3 ڈرامہ

ڈرامہ یہ اردو نثر کی دوسری صنف ہے۔ڈرامہ نہ محض مکالمے میں لکھی تحریر کا نام ہے نہ محض واقعات و کردار کا مجموعہ ہے۔ یہ نہ صرف محض تفریحی ہے۔اس میں مکالمہ زبان پلاٹ اور کردار کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ڈرامے کی روایت بہت قدیم ہے۔آغا حسن نے اندر سبھا لکھی آغا حشر نے اردو ڈرامے کو نہ صرف ناٹک کمپنیوں سے خود کو وابستہ کر لیا انھوں نے ادبی حیثیت سے اہم مقام حاصل کیا۔محمد حسین آزاد مرزا ہادی،عبدالحلیم شرر، دریا آبادی نے بھی ڈرامے لکھے۔ڈرامے کی تاریخ میں ایک اہم موڑ امتیاز علی تاج کا ہے انھوں نے ''انارکلی'' ڈرامہ لکھا۔موجود دور میں حبیب تنویر محمد حسین، زاید زیدی وغیرہ نے قدم آگے بڑھایا۔آج کا ڈرامہ ہندوستانی تہذیب سے قریب ترین ہے۔

1.3.4 افسانہ

نقادوں نے افسانے کی تعریف مختلف انداز میں بیان کی ہے۔کسی نے افسانے کے تشکیل عنصر پر زور دیتے ہوئے اس کی تعریف کی تو کسی نے دوسرے عنصر کو غالب قرار دیتے ہوئے اس تشریح کی ہے ان نقادوں کے بیان کی روشنی میں ہم افسانہ کی تعریف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں۔''افسانہ نثری تخلیص ہے جس میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت ہو اور کسی خاص مرکزی تاثر پر استوار ہو، حیات انسانی کا کوئی گوشہ یا عکس پیش کر کے اسکی زبان پر کشش اور اندر تحریر انتشار سے پاک ہو۔

ایک کامیاب افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا موحول اور کردار پلاٹ ہم آہنگ ہو زبان عام فہم اور الفاظ معنی خیز ہوں وحدت تاثر جسے مختصر افسانے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اسے قائم رکھنے کے لیے تکراز خیالات سے گریز کیا جائے،مقصد کی بلندی فنی چابکدسی،اور کردار کی نفسیات سے گہری واقفیت حاصل ہونی چاہیے۔اس میں اتنی جاذبیت ہو اور کشش ہو کہ قاری کہانی میں کھو جائے اور افسانہ نگار افسانے کے تمام تشکیلی اجزا میں توازن و ہم آہنگ برقرار رکھنے کیلے ساتھ ساتھ زبان بیان پر اچھی طرح قدرت حاصل ہو یعنی نقطہ نظر اور انسانی نفسیاتی سے گہری واقفیت رکھنے والا ہو۔

1.4 خلاصہ

وجہی نے پہلی بار اردو نثر کو فارسی نثر کی سطح پر لانے کے لیے شعوری کوششیں کی تھی اور دوسرے یہ کہ اس عمل سے اردو نثر کو ایک ادبی اسلوب بھی دیا گیا۔''سب رس'' وجہی کی پہلی نثری کتاب ہے۔جو اردو ادب میں نثری آغاز کا سبب بنی۔سب رس جس کا موضوع مذہبی نہیں ہے۔اس کا اسلوب ادبی اسلوب میں آتا ہے۔وجہی کو اسی لیے ہم طرز کا فنکار کہہ سکتے ہیں۔وجہی سے پہلے اور بعد مذہبی رسائل میں جو تبلیغ کرنا مقصد تھا۔

اردو ناول کی ابتداء کے سلسلے میں مولوی کریم الدین احمد کے ناول اور رسوا کے شاہکار ناول ''امراو جان ادا'' کا نام لیا جاتا ہے۔نذیر احمد کے ناول زیادہ تر اصلاحی ہے۔ان کے ناول اردو کے ابتدائی ناولوں میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔سرشار بھی اہم ناول نگار ہیں۔سرشار نے لکھنو کے زوال آمادہ تمدن کی تصویر کشی کی ہے۔ان ناولوں کو کافی اہمیت حاصل ہے.

افسانہ سے مراد ''افسانہ نثری تخلیص ہے جس میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت ہو اور کسی خاص مرکزی تاثر پر استوار ہونے کے ساتھ حیات انسانی کا کوئی گوشہ یا عکس پیش کر کے اسکی زبان پر کشش اور اندر تحریر انتشار سے پاک ہو۔

1.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات مختصر انداز میں تحریر کیجیے۔

(۱) اردو نثر سے کیا مراد ہے؟ واضح کیجیے۔

(۲) اردو نثر کی اہمیت بیان کیجیے؟

(۳) اردو نثر میں کن اصناف کا شمار ہوتا ہے؟

(۴) ناول کی تعریف بیان کر کہ اس کی اہمیت واضح کیجیے؟

(۵) افسانہ اور ڈرامہ پر مختصر نوٹ لکھیے؟

1.6 فہرہنگ

الفاظ	:	معنی
یونٹ	:	باب یا حصہ
ایکس پرٹ	:	ماہر
مکالمے	:	محاورے
پلاٹ	:	افسانہ کا قصہ
مقالمہ نگاری	:	زبان و بیان
اجزائے ترکیبی	:	اجزاء
فن	:	مہارت
صنف	:	قسم

1.7 شفارش کردہ کتابیں

1۔ نمائندہ مختصر افسانے — اطہر فاروقی
2۔ تاریخ ادب اردو — ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔ اردو کے تیرہ افسانے — ڈاکٹر اطہر پرویز۔
4۔ تاریخ ادبِ اردو — دارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد)
5۔ اردو ڈرامے کا ارتقا — عشرت رحمانی

6۔ آغا حشر اور انکے ڈرامے وقار عظیم
7۔ اردو ڈرامہ نگاری تاریخ ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی
8۔ تزئین ادب کا ڈرامہ نمبر شیر پور

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۲ : ناول نگاری

اکائی کے اجزاء

2.1 مقاصد
2.2 تمہید
2.3 موضوعات
2.3.1 ناول کی تعریف، آغاز وارتقاء
2.3.2 ناول کا فن اور اردو ناول نگاری
2.3.3 ناول کے اجزائے ترکیبی
2.3.4 ناول کے قسمیں
2.4 خلاصہ
2.5 نمونے کے امتحانی سوالات
2.6 فہرہنگ
2.7 شفارش کردہ کتابیں

2.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔۔۔
☆ ناول کی تعریف بیان کرسکیں گے۔
☆ ناول کے اجزائے ترکیبی سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ ناول کی اقسام سے واقف ہوسکیں گے۔

2.2 تمہید

ناول قصہ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ داستان، ڈرامہ اور افسانے کسی طرح ناول میں بھی قصہ پن یا افسانویت ہوتی ہے۔ اس میں انسان کی معاشرتی زندگی کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ واقعات ومشاہدات، تجربات وخیالات، افکار ونظریات کی آمیزش اور ربط وضبط سے یہ تصور ناول کے پلاٹ میں اس طرح مرتب کی جاتی ہیں کہ قاری پر اس کا واضح نقش ابھر آتا ہے۔

اصناف ادب کا وجود انسانی سماج اور معاشرے کے بدلتے ہوئے روپ پر منحصر ہوتا ہے۔ درباروں کی عیش وعشرت سے لبریز زندگی نے شاعری کو پروان چڑھایا۔ جاگیردارانہ نظام معاشرت نے داستانوں کو جنم دیا وہیں صنعتی انقلاب نے ناول اور افسانے کے وجود میں آنے کے اسباب پیدا کیے۔ یعنی ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

2.3 موضوعات

2.3.1 ناول کی تعریف،آغاز وارتقاء

ناول ہمارے ادب میں انگریزی ادب کے زیر اثر پروان چڑھا۔ ویسے ناول دراصل اطالوی ITALIAN زبان کے لفظ NOVELA سے مشتق ہے جو انگریزی کے توسط سے اردو میں آیا۔ روزمرہ کے واقعات وحادثات کو تسلسل اور ربط کے ساتھ اٹلی والے ناولا کے نام سے یاد کرتے تھے۔

اردو ادب میں جو اصناف ادب مغرب سے آئے اُن میں نے ناول سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ناول ایسی صنف ادب ہے جن سے ہر فرد لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ ناول کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایک بات سامنے آتی ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل اردو ادب میں داستانوں کا دور رہا ہے۔ داستان کے شباب کا زمانہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان سیاسی، معاشی اور سماجی حیثیت سے بڑی ہی پستی کا شکار تھا۔ اس زمانے میں ادب کی سرپرستی درباروں میں ہوتی تھی۔ ادیب دربار سے جڑے ہوتے تھے اسی لیے داستانیں کسی نہ کسی بادشاہ، شہزادے یا امیر کی فرمائش پر ہی قلمبند کی گئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب آیا۔ زندگی پوری طرح سے بدل گئی۔ اسی سے ادب میں بھی تبدیلی آئی۔ اس بدلتے ہوئے حالات زندگی اور ماحول کے مطابق زندگی میں خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کرنے کا اہم کام سرسید احمد خاں اور اُن کے افتقار نے کیا۔

1857ء کے بعد یہ حالت صرف اردو تک محدود نہیں تھی بلکہ سارے ہندوستان کی زبانیں ان تبدیلی اس وجہ سے نئے روپ میں ڈھل ادب نظر آتی ہے لیکن اصلاح کا رویہ تمام زبانوں میں یکساں اور عام تھا۔ تمام ہندوستانی زبانوں نے وقت حالات اور ماحول کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے نئے طرز فکر، نئے تصورات اور نئے خیالات کو جگہ دی اور فکر وخیال کی جدت نے اصناف ادب میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جن کی وجہ سے نئی اصناف ادب کی ضرورت پڑی۔ اس ضرورت کے نتیجہ کے طور پر ناول کی صنف وجود میں آئی۔ یہ بات سچ ہے کہ ناول کا لفظ انگریزی ادب کے ذریعہ ہندوستان آیا لیکن ہندوستان میں وہ مخصوص حالات تھے جنھوں نے ہندوستانی ادیبوں کو ناول نگاری کی طرف راغب کیا۔ حقیقت میں یہ وقت بھی اہم ضرورت بھی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ کہانی ہر زمانے میں ادب کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ اسی مقبولیت کے مدِنظر ہندوستانی ادیبوں نے زندگی کی حقیقتوں اور اپنے خیالات کو قصوں میں سمونا شروع کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کسی بھی ہندوستانی زبان میں کوئی ناول نہیں ملتا۔

اردو میں ناول کا آغاز اہم سماجی تبدیلیوں کا مظہر ہے۔ کیونکہ ہندوستانی سماج میں وہ تمام حالات پیدا ہوگئے تھے جو ناول کی پیدائش کے لیے ضروری ہیں۔ مختلف تعلیمی سرگرمیوں، مدرسوں اور کالجوں میں نے مختلف قسم کے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ ساتھ ہی امراء داں طبقہ میں نئی تعلیمی روشنی کی وجہ سے سماجی برائیوں خاص کر جہالت۔ اندھی تقلید اور عورتوں میں تعلیم کا بڑھتا ہوا رجحان ناول کے آغاز کے لیے نیک شگون ثابت ہوا۔ ابتدائی ناول نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر مرزا ہادی رسوا جیسے لوگ شامل ہیں۔

2.3.2 ناول کا فن اور اردو ناول نگاری

کہا جاتا ہے کہ فن اظہار خیال کی سب سے قدیم شکل ہے۔ پرانے زمانے میں جب انسان غاروں میں رہتا تھا۔ جنگلی جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ اُس وقت اس نے غاروں میں تصویریں بنائیں اور اپنے ذہن وشعور سے کام لیتے ہوئے مسرت اور خوشی کے جذبات کو ان تصویروں میں اتار دیا۔ اتنا ہی نہیں فن نے انسان کو زندہ رہنے کے آداب سکھائے اور زندگی میں ایک سلیقے کی تربیت کی اور بہترین زندگی کے خواب دکھلائے۔ فن کار اپنی تمام تر ذہنی صلاحیت اور اپنے تصور کی وسعت کو کام میں لاتا تھا تا کہ اپنے خیال کو بھرپور طور پر پیش کر سکے تا کہ جو بات دل سے نکلی ہے وہ دل پر انداز ہو۔

فن ہمارے ان جذبات کا اظہار ہے جن میں قوت گویائی نہیں ہوتی۔ فن ہماری روح کو زبان عطا کرتا ہے۔ غیر معمولی مسرت اور بے انتہا غم انسان کو خاموش کر دیتا ہے۔ لیکن جب ہم بڑے مصوروں کی تصویروں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے گویا ان تصویروں میں مسرتوں اور غموں کو زبان مل گئی ہے۔ ہمارے خیالات اور احساسات کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو فن کے ذریعہ بڑی حد تک ظاہر نہ ہو سکتا ہو۔ گویا ہمارے احساس حسن اور قوت متخیّلہ نے دنیا کے چاروں طرف جال پھینک دیا ہے جن کی لپیٹ میں انسان کی تمام آرزوئیں، حسرتیں اور اداسیاں آجاتی ہیں۔ جب ہم تصویروں دیکھتے ہیں یا ہماری نظر میں حسین مجسموں پر پڑتی ہے۔ تو وہاں ہمیں ان رنگوں اور شکلوں کے علاوہ کچھ اور بھی نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان رنگوں اور شکلوں کے پیچھے ہمارے حسین خواب ہیں جو حقیقتوں کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔

فن کے بارے میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فن انسان کی اس تخلیقی امنگ کا نتیجہ ہے۔ جو آدمی زندگی سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اُسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں یکسانیت کو دور کرنے کے لیے ایک قسم کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ فن کسی مخصوص قوم یا نسل کی ملکیت نہیں بلکہ یہ عام انسانوں کی ملکیت ہے۔ فن کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں ہے۔ ساری دنیا اس کا مسکن ہے فن اپنے اظہار کے لیے افراد کا سہارا لیتا ہے۔ یہ افراد اپنے اپنے احساسات رکھتے ہیں جن کو وہ اپنے مخصوص شعور کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔

دنیا میں مختلف فن کا ایجاد ہوتا رہا ہے جن میں فن تعمیر، مصوری، موسیقی، رقص جیسے فنون لطیفہ جن میں ادب اور ادبی فن پارے بھی شامل ہیں۔ ان تمام فنون لطیفہ سے ہمیشہ فن کی ترقی اور توسیع ہوتی رہی ہے۔ ادبی فن پاروں میں کہانی قصہ داستان ناول۔ افسانہ اور شاعری کی مختلف اصناف شامل ہیں اور ہر ایک فن پارے کی فنی خصوصیات اور لائحہ عمل ہے۔ ناول کا فن مختلف مراحل مل کر ناول کو مخصوص شکل دینے میں مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے۔

2.3.3 ناول کے اجزائے ترکیبی

(1) قصہ

ناول واقعات میں قصہ پن پیدا کرنا اور قصے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانا آسان کام نہیں۔ کسی کے اندر یہ قوت خداداد ہوتی ہے کہ قصے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنا سکتا ہے۔ خیر یہ عنصر خواہ کسی درجے میں ہو ناول میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ بنیادی پہلو ہے جس کے بغیر ناول، ناول نہیں ہو سکتا۔

''قصہ کی خوبی یہی ہے کہ ہم ہر دم یہی پوچھتے ہیں کہ ''اچھا پھر کیا ہوا'' قصہ میں واقعات کو ایک دوسرے سے باندھنے والا تار کسی وقت ٹوٹنا نہ چاہیے۔ بلکہ یہ تار جتنا ہی زیادہ طویل ہوگا اور واقعات جتنے اچھے گذرے ہوئے ہوں گے اتنا ہی قصہ دلچسپ ہوگا اور اتنا ہی زیادہ اس میں جی لگے گا۔ قصہ میں انتظار یا تجسس کی خلش خاص چیز ہے اور جتنی زیادہ انتظار کی خلش ہوگی اتنا ہی دلچسپ قصہ ہوگا۔

(2) پلاٹ

قصے کے ڈھانچے کو پلاٹ کہتے ہیں جس کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ انگریزی نقاد ہڈسن نے پلاٹ کی تعریف کی ہے۔ وہ واقعات جو قصے کے افراد کو پیش آئیں اور وہ افعال جو ان سے سرزد ہوں مجموعی حیثیت سے اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ واقعات جس صورت میں عمل میں آتے ہیں اس ترتیب کا نام پلاٹ ہے۔ پلاٹ میں وحدت اور تسلسل ضرور ہونا چاہیے اس میں ہر کردار، ہر واقعہ اگر اس میں طنز و مزاح ہے تو وہ بھی اپنے اپنے زاویے سے پلاٹ کی طرف روشنی ڈالے ورنہ ناول کا کینوس خالی خالی نظر آئے گا۔ اور سمت کر چھوٹا ہو جائے گا۔ کوئی ناول نگار ناول لکھتے وقت اپنے پلاٹ کے کنویس کو اپنی نظر سے اوجھل نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے پلاٹ ناول کا اہم جز ہے اس کے بغیر ناول کی تشکیل ناممکن ہے۔ کیوں کہ ایک خاص پلاٹ پر ہی ناول کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

(3) کردار

کرداروں کی تخلیق بھی مرکزی خیال کے تحت عمل میں آتی ہے کیونکہ ناول نگار ایسے ہی کرداروں کا انتخاب کرتا ہے جو اُسے متاثر کرتے ہیں یا جن سے اسے مرکزی خیال کے اظہار اور تکمیل میں مدد ملنے کی امید ہوتی ہے۔ ناولوں میں عام طور پر انسانی کردار ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ کردار حقیقی زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن ناول نگار اگر کرداروں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے تو نہ صرف اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ قصہ بھی بکھر جاتا ہے اس لیے کردار نگار کو اپنے مرکزی خیال قاری کی خواہشات اور کرداروں کی نفسیات تینوں باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اچھا کردار وہی کہلاتا ہے جس میں زندگی کی حرارت موجود ہو قوت عمل اور زندگی کو بہتر بنانے کا جذبہ موجود ہو۔

(4) مکالمہ نگاری

ناول میں مکالمہ نہ صرف کردار کے جذبات، خیالات، احساسات اور خواہشات کا ترجمان ہوتا ہے۔ بلکہ یہ پلاٹ کے ارتقاء میں بھی مدد دیتا ہے۔ یہ قصہ کو روشنی بخشتا ہے۔ اس کی اندرونی فضاء کو جگاتا ہے اور حادثات و واقعات کی تشریح کرتا ہے۔ یہ ناول نگار کے نظریات کے اظہار کا ایک آلہ اور اس کے مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ یعنی مکالمہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ اسے ادبی سلیقہ سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

(5) زماں ومکاں

ناول میں زماں و مکاں کا تصور واقعات، حادثات اور کرداروں میں حقیقت کے رنگ کو گہرا کرتا ہے۔ کیونکہ ہر علاقے کی کچھ

نہ کچھ اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اس طرح ہر زمانہ بھی مخصوص خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور ہر قوم وطبقہ بھی اپنی مخصوص تہذیب وتمدن اور سماجی اقدار رکھتا ہے۔ان کی یہ ہی خصوصیات اور علامات ان میں امتیاز اور انفرادیت قائم رکھتی ہے۔

تاریخی ناولوں میں زماں ومکاں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کیوں کہ تمام تر واقعات وکردار کی بنیاد ماضی پر ہوتی ہے۔اس لیے تاریخی ناولوں میں اس کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔

(6) اسلوب

اگر یہ درست ہے کہ ناول کی کامیابی کا راز کہانی کہنے کے گرد میں پوشیدہ ہے تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس گر میں حسن اور تاثر بات کہنے کے ڈھنگ اور طریقہ کار سے پیدا ہوتا ہے۔بات کہنے کا ڈھنگ یا طریقہ کار اسلوب کہلاتا ہے یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔

(7) نقطۂ نظر

ادب میں زندگی کے مختلف عکس کو پیش کیا جاتا ہے۔زندگی کی پیش کش کے سلسلے میں ناول نگار کا نکتہ نظر سامنے آتا ہے۔اسے ناول نگار کا فلسفہ حیات بھی کہا جاسکتا ہے۔اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ناول نگار کو کوئی فلسفہ یا اخلاقی درس اپنی ناول کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ضروری ہے۔اعلیٰ ناول نگار زندگی کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اس لیے وہ زندگی کی بابت کچھ نہ کچھ نتائج پر ضرور پہنچ جاتا ہے جن سے ہم بھی متاثر ہوتے ہیں۔ناول میں کردار کی خصوصیت کا تجزیہ انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ باہمی تعلقات کی پیچیدگیاں وغیرہ اس طرح بیان ہوتی ہیں کہ ہم کسی نہ کسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔

2.3.4 ناول کے قسمیں

(۱) واقعاتی ناول

ناول کی ایک سیدھی سادی قسم واقعاتی ناول کی ہے۔جس میں قصہ کی تمام تر دلچسپی کا انحصار واقعات پر ہوتا ہے۔یہاں کردار واقعات کے خالق نہیں ہوتے بلکہ واقعات کرداروں کو جنم دیتے ہیں۔اس میں مختلف اور دلچسپ واقعات ایک لڑی میں سلیقہ سے پروکر پیش کیے جاتے ہیں۔ناول نگار اور قاری کی توجہ کا مرکز صرف واقعات ہوتے ہیں۔اس طرح کے ناولوں میں کردار کی حیثیت ضمنی و ثانوی ہوتی ہے۔یہ قصہ کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) کرداری ناول

ناول کے اقسام میں سب سے زیادہ اہمیت اس قسم کے ناولوں کو دی جاتی ہے جنھیں کرداری یا کردار کے ناول کہا جاتا ہے۔اس قسم کے ناولوں میں قصہ کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی اور واقعات کسی خاص نقطہ کی طرف جاتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔اگر کوئی ہلکی سی لہر قصے کی ہو بھی تو تمام کرداروں کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔کردار قصے سے آزاد نظر آتے ہیں۔واقعاتی ناولوں میں واقعات سے اہم نتائج نکلتے ہیں۔کرداری ناول میں واقعات محض کردار کی خصوصیات کا انکشاف کرتے ہیں۔

(۳) حادثاتی ناول نگاری

حادثاتی یا مہماتی ناول، ایسی ناول کی قسم ہے جن میں واقعاتی اور سیرتی دونوں کی خصوصیات ملتی ہیں۔ان میں ایک قصہ سے دوسرا قصہ نکلتا ہے۔قصہ میں تسلسل اور دلچسپی کے عناصر شامل کیے جاتے ہیں اور ایک خوش آئند انجام کے ساتھ قصہ ختم ہوجاتا ہے۔ یہاں واقعات اور کردار دونوں کی حیثیت منفرد ہوتی ہے اور عام طور پر ایک دوسرے کو متاثر نہیں کرتے۔اس کے باوجود ان میں اعلیٰ قسم کے کردار بھی پائے جاتے ہیں۔

(۴) مہماتی ناول نگاری

مہماتی قسم کے ناولوں میں کردار کو ایک مہم سے دوسری مہم سر کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ان ناولوں میں ایک حادثہ کے بعد دوسرا حادثہ اور ایک مہم کے بعد دوسری مہم شروع ہوجاتی ہے۔جن کا کوئی منطقی جواز پیش نہیں کیا جاتا۔ بلکہ یہاں اتفاقات اور حادثات اور قسمت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ان ناولوں کا مقصد واقعات کا بیان یا کردار نگاری نہیں ہوتا بلکہ یہ قارئین کی خواہشات کی تکمیل اور ان کی آرزوؤں اور منزلوں کی تسکین کا باعث ہوتے ہیں اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ان میں پلاٹ بھی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ کرداروں اور واقعات پر ہی توجہ صرف کی جاتی ہے۔

(۵) صحافتی ناول

صحافتی ناولوں کی ایک امتیازی خصوصیت اس کا مزاح ہے جس کے لیے ناول نگار ناول میں زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کرتا ہے اور وہ واقعات اور کردار کو ایسے ماحول میں پیش کرتا ہے۔صحافتی ناولوں کے کردار اور پلاٹ زیادہ پھیلاؤ چاہتے ہیں اس لیے عام دلچسپی کے موضوعات ہی صحافتی ناولوں کو جلا بخشتے ہیں۔صحافتی ناول کی بہترین مثال فسانۂ آزاد کہی جاسکتی ہیں۔

(۶) اصلاحی ناول

اصلاحی ناول سماج یا معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں، خامیوں یا اخلاق و عادات کی اصلاح کے مقصد سے لکھے جاتے ہیں۔عام طور پر سماج،معاشرہ،فرد یا عوام میں پھیلی ہوئی بے چینی،اضطرابی کیفیت یا مسائل کو دور کرنے کے لیے یا صالح معاشرے کی تشکیل میں معاون وممد گار ہونے والے اخلاق عادات،حسن سلوک،رواداری یا ہمدردی کے جذبوں پر مشتمل اصولوں کو فروغ دینے کے مقصد سے لکھے جانے والی ناول اصلاحی ناول کہلاتے ہیں

(۷) تاریخی ناول

مواد یا موضوع کے لحاظ سے ناول کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ ہر ناول نگار ایک خاص قسم کا تجربہ کرتا ہے۔اور اس کی بنا پر اس کا ناول فن میں ایک خاص اضافہ کرتا ہے۔ناول کے مختلف اقسام میں تاریخی ناول بھی ایک نمایاں قسم ہے۔

تاریخی ناول کا کمال یہ ہے کہ کسی پرانے دور کا نقشہ اس حسن وخوبی سے کھینچا جائے کہ وہ دور بالکل جیتا جاگتا ہمارے سامنے آجائے۔تاریخی ناول نگار کے لیے ضروری ہے اُسے تاریخ کا بہت گہرا عالم ہو۔دوسرے تاریخی زمانے کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے اس میں ایک خاص قسم کی قوت تخیل ضروری ہے۔تیسرے ناول نگار کا اپنے تاریخی ماحول سے کسی نہ کسی طرح کا ذاتی تعلق ہو۔

(۹) نفسیاتی ناول

اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ میں ناول کا آغاز اصلاحی ناولوں میں ہوتا ہے۔لیکن اس کو تکمیل کی منزل پر پہنچانے کا کام نفسیاتی ناول انجام دیتے ہیں۔اصلاحی ناولوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی ناول کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے پھر تاریخی ناول نگار کا رجحان بڑھنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ ہی نفسیاتی ناول ادبی افق پر رونما ہونے لگتے ہیں۔

(۱۰) رومانی ناول

ناول کے اقسام میں رومانوی ناول بھی ایک اہم قسم کی ناول ہے۔عام طور پر ناول تخیل کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں۔یہاں زندگی کے عام واقعات اور کرداروں کو تخیل کی مدد سے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انہیں پڑھ کر قاری حیرت زدہ اور خوف زدہ ہوجاتے۔یہ ناول قاری کی تسکین اور ان کی حسرتوں اور آرزوں کی تکمیل کا باعث ہوتے ہیں ایسی حقیقتیں جن تک عام انسان کی رسائی ممکن نہیں وہاں رومانوی ناولوں کے ذریعے آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

(۱۱) سماجی ناول

ناول کی اقسام میں سماجی ناول بھی ایک اہم قسم ہے۔یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ کوئی بھی ادب سماج ہی میں پروان چڑھتا ہے۔ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اور ناول انسانی زندگی کی حقیقت نگاری پر زور دیتا ہے اس سے ناول میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہونے والے سماجی عوامل قوانین اور اصولوں سے بحث بھی لازمی ہوجاتی ہے۔سماج میں پیدا شدہ بے اطمینانی افراتفری اور رسوم ورواج کو موضوع بنا کر ارادی یا غیر ارادی طور پر لکھے جانے والے ناول کو ہم سماجی ناول کہہ سکتے ہیں۔

(۱۲) جاسوسی ناول

ادب کا اہم فریضہ اپنے قاری کو مسرّت اور انبساط مہیا کرانا ہے۔اس لیے ایک اچھا ادبی فن پارہ تخلیق کرتے وقت تخلیق کا اپنے قاری کی دلچسپی، طبیعت اور اُس کے پسندیدہ موضوعات کو سامنے رکھ کر ہی اپنا تخلیقی فن پارہ تحریر کرتا ہے اور انسانی فطرت میں تجسس اور کچھ جاننے کی جستجو انسان کو سراغ رسانی یا جاسوسی کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ اس لیے جاسوسی ناول کہا جاتا ہے۔

2.4 خلاصہ

ناول انگریزی ادب کے توسط سے اردو میں آیا۔ویسے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قصہ کہنا سننا انسانی فطرت اور جبلیت میں داخل ہے۔کچھ لوگ تو یہ بھی مانتے ہیں کہ قصہ کا وجود ابتدائے آفرینش سے ہی کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے۔حضرت آدم کا جنت میں خوشۂ گندم کو ہاتھ لگانا اور آدم وحوّا کا زمین پر پھینکا جانا بذات خود ایک قصہ ہے۔ناول قصہ نگاری کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔داستان، افسانہ اور ڈرامہ ہی کی طرح اس صنف کے مزاج کی تکمیل قصہ پن یا افسانویت سے ہوتی ہے۔اس میں انسان کی معاشرتی زندگی کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ناول نگار ایک انسان ہونے کی وجہ سے خود بھی خیالات ومحسوسات کا مرکز ہوتا ہے اور زندگی کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے دیکھنے کی وجہ سے دوسروں کے خیالات ومحسوسات سے بھی روشنی حاصل کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قاری پر ناول نگار کے نظریے، مقصد اور تصویر کا اثر پڑتا ہے۔مثلاً شرر کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ اثر ابھرتا ہے کہ عیسائیوں کی بہ نسبت مسلمان زیادہ بہادر، جرأت منداور

خلیق ہوتے ہیں۔ ہادی رسواء کا ناول امراؤ جان ادا قارئین کے اندر یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ طوائفین صرف بے حیا، بے شرم اور بد کردار ہی نہیں ہوتیں بلکہ پاکدامن بھی ہوتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ناول قصہ نگاری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں مقصدیت ناگزیر ہے

2.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات تحریر کیجیے۔۔

(۱) اردو ناول نگاری کی تعریف اور اہمیت بیان کیجیے؟

(۲) اردو ناول کا آغاز وارتقاء بیان کیجیے؟

(۳) ناول کی قسمیں مفصل بیان کیجیے؟

(۴) ناول کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے؟

(۵) ناول نگاری پر مضمون تیار کیجیے؟

2.6 فہرہنگ

الفاظ	:	معنی
مشابہ	:	ایک جیسی
منہمک	:	مصروف
بزدآزما ہونا	:	مقابلہ کرنا
اصلاح	:	درستگی
بےاعتدالیاں	:	بےضابطگیاں، برائیاں
متحرک	:	حرکت کرنے والے
مستند	:	سند یافتہ
قرین قیاس	:	خیال کے مطابق

2.7 شفارش کردہ کتابیں

(1) ناول کیا ہے؟ ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نورالحسین
(2) اردو ناول کی تاریخ وتنقید علی عباس حسینی
(3) بیسویں صدی میں اردو ناول ڈاکٹر یوسف سرست
(4) اردو ناول کا آغاز وارتقاء ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی
(5) ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی

☆☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۳ : افسانہ نگاری

اکائی کے اجزاء

3.1 مقاصد
3.2 تمہید
3.3 موضوعات
3.3.1 افسانے کا مفہوم
3.3.2 افسانے کی تعریف
3.3.3 افسانے کی اہمیت
3.3.4 افسانے کا فن اور افسانے کا ارتقاء
3.3.5 افسانے کے فنی لوازم
3.4 خلاصہ
3.5 نمونے کے امتحانی سوالات
3.6 فہرہنگ
3.7 شفارش کردہ کتابیں

3.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔۔۔

☆ افسانے کے فن سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ افسانہ نگاری کی اہمیت بیان کرسکیں گے۔

☆ افسانہ نگاری کا اردو میں ارتقاء کس طرح ہوا؟ یہ بتاءسکیں گے۔

☆ افسانہ نگاری کے فنی لوازم کا جائزہ لے سکیں گے۔

3.2 تمہید

اردو ادب میں افسانہ کو وہی مقام حاصل ہے جو اردو شاعری میں غزل کو۔ جس طرح اردو شاعری کی سب سے زیادہ محبوب اور

پسندیدہ صنف ہونے کا اعزاز غزل کو حاصل ہے اسی طرح اردو نثر میں افسانہ سب سے زیادہ محبوب صنفِ نثر ہے۔ ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں افسانے لکھ کر اردو میں مختصر افسانے کی بنیاد ڈالی۔ یوں افسانہ کا آغاز ہوا۔لیکن افسانے کو سمجھنے کے لیے اس کے مفہوم اور تعریف کا ادراک بھی ضروری ہوتا ہے۔اس لیے یہاں اردو افسانے کے مفہوم اور تعریف پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

3.3 موضوعات

3.3.1 افسانے کا مفہوم

افسانہ اردو ادب کی نثری صنف میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ادبی اصطلاح میں افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعے یا پہلو کی وہ خلاّقانہ اور فنی پیش کش ہے جو عموماً کہانی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ایسی تحریر جس میں اختصار اور ایجاز بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وحدتِ تاثر اس کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ناول زندگی کا کل اور افسانہ زندگی کا ایک جز پیش کرتا ہے۔جبکہ ناول اور افسانے میں طوالت کا فرق بھی ہے۔اردو ادب کے افسانوی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب کا اپنا اپنا الگ دور رہا ہے۔ان میں افسانہ سب سے آخر میں ادبی افق پر نمودار ہوا اور سب سے زیادہ مقبول صنف نثر بن گیا۔افسانہ ایک ایسی حقیقت یا سچ کا بیان ہے جو چاہے۔پورا سچ (بمعنی،حقیقت) نہ بھی ہو،مگر وہ (سچ) ہمیں بہت آگے تک سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔یہ ہماری جمالیاتی حس کو ساتھ لے کر آفاقی سچائیوں اور حقیقتوں کی تلاش اور پہچان میں مدد کرتی ہے۔گویا ہوتا ہے انسان کے اپنے اندر مکالمے اور مباحثے کی فضا قائم کرتا ہے

3.3.2 افسانے کی تعریف

افسانے کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادبی اصطلاح میں افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعے یا پہلو کی وہ خلاّقانہ اور فنی پیش کش ہے جو عموماً کہانی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ایسی تحریر جس میں اختصار اور ایجاز بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔وحدتِ تاثر اس کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ناول زندگی کا کل اور افسانہ زندگی کا ایک جز پیش کرتا ہے۔جبکہ ناول اور افسانے میں طوالت کا فرق بھی ہے۔

> ''یہ ایک ایسی نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے دو گھنٹے کا وقت لگے۔''

اسی طرح معروف مشرقی نقاد سید وقار عظیم مختصر افسانے کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں کہ ان کی یہ تعریف مشرقی نقادوں میں اہمیت کی حامل ہے وہ کہتے ہیں۔

> ''مختصر افسانہ ایک ایسی مختصر داستان کو کہتے ہیں جس میں ایک خاص کردار، ایک خاص واقعہ، ایک تجربے یا تاثر کی وضاحت کی گئی ہو نیز اس کے پلاٹ کی تفصیل اس قدر منظّم طریقے سے

بیان کی گئی ہو کہ اس سے تاثر کی وحدت نمایاں ہو، افسانہ عصری قدروں کی ترجمانی کرتا ہو۔''

3.3.3 افسانے کی اہمیت

افسانہ کو داستان کی ایک صنف بھی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ کم سے کم وقت میں واقعات کو دلچسپ شکل میں پڑھنے والے کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی داستان کہلاتا ہے۔ اس میں کردار وایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس میں افسانہ نگار اپنے آپ کو سامنے رکھ کر افسانے کو پیش کرتا ہے اور یہ بتانے کی کوشیش کرتا ہے کہ یعنی افسانہ میں شامل کردار کتنے اہم اور جامع ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے بغیر اپنا سفر طئے نہیں کر سکتے۔ افسانے کی اہمیت کا پتہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے افسانے کی کہانی ایک خوبصورت انداز میں پیش کی جاتی ہے کہ وہ قارئین کے ذہن میں نقش کر جائے۔ اور اسے با آسانی سمجھ میں آسکیں۔ داستان یعنی مختصر داستان کو افسانے کی دوسرے شکل دی گئی ہے۔ جس وقت قارئین اپنے کم وقت میں افسانہ پڑھتے یا دیکھنے لگتا ہے تو اس کی دلچسپی بڑھنے لگتی ہے۔

افسانہ نہایت ہی دلچسپ اور خوبصورت ہوتا ہے۔ جسے افسانہ نگار اپنے صلاحیت کی بناء پر پڑھنے والے کو افسانہ کی طرف توجہ رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ افسانہ نگار افسانے کو اس انداز کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے کا زیادہ وقت بھی نہ جائے اور اسے پوری طرح سے افسانہ سمجھ میں بھی آسکیں۔ اس سے پتہ لگایا جا سکتا ہے ہماری زندگی کی عکاسی افسانہ نگار کس طرح ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

3.3.4 افسانے کا فن اور افسانے کا ارتقاء

(ا) افسانہ کا فن:

نقادوں نے افسانے کی تعریف مختلف انداز میں بیان کی ہے۔ ہم افسانہ کی تعریف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں۔ ''افسانہ نثری تخلیص ہے جس میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت ہو اور کسی خاص مرکزی تاثر پر استوار ہونے کے ساتھ حیات انسانی کا کوئی گوشہ یا عکس پیش کر کے اسکی زبان پر کشش اور انداز تحریر انتشار سے پاک ہو۔

افسانے کے لیے ضروری ہوتا ہے اس کے عناصر ترکیبی یا فنی لوازم۔ جس کے بغیر افسانہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان مین رکردار پلاٹ ہم آہنگ ہو زبان عام فہم اور الفاظ معنی خیز ہوں وحدت تاثر جسے مختصر افسانے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسے قائم رکھنے کے لیے تکرار خیالات سے گریز کیا جائے، مقصد کی بلندی فنی چابکدسی، اور کردار کی نفسیات سے گہری واقفیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس میں اتنی جاذبیت ہو اور کشش ہو کہ قاری کہانی میں کھو جائے اور افسانہ نگار افسانے کے تمام تشکیلی اجزا میں توازن و ہم آہنگ برقرار رکھنے کیلے ساتھ ساتھ زبان بیان پر اچھی سے واقف ہو جائے اور اسے با آسانی سمجھ میں آسکیں۔

(۲) افسانے کا ارتقاء:

اردو افسانہ کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ جبکہ ۱۸۵۷ کے بعد ہندوستانی زندگی کے تمام شعبہ حیات تصادم کا شکار تھا۔ بہت سی مذہبی و اصلاحیتی تحریکیں سرگرم عمل تھیں۔ ان تحریکوں کا ان پر اثر لازمی تھا۔ اور عمدہ اردو افسانہ ہی اپنے عہد کی عکاسی زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان بن گیا۔ پریم چند کو اولین افسانہ نگار ہونے کا مسئلہ اختلافی سہی لیکن اس حقیقت سے اختلاف ممکن نہیں کہ پریم چند سب سے پہلے اردو افسانہ کو زندگی کی حقیقتوں سے براہ راست روشناس کردایا۔ اور اسے قومی جذبات، ذہنی کشمکش اور دیہاتوں کی معاشی وسماجی تبدیلیوں کا ترجمان بنایا۔ انھوں نے متوسط طبقہ اور دیہاتوں کی معاشی وسماجی زندگی کی موثر تصویریں پیش کیں۔ کسانوں کی زندگی میں پیش آنے والی گھر دری حقیقتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنادیا۔

پریم چند نے اردو افسانہ میں حقیقت نگاری سے آشنا کرایا تھا اس کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں سدرشن، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے نام آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پریم چند کی واقعیت کا گہرا اثر ملتا ہے۔ علی عباس حسینی نے دیہاتی زندگی کے دکھ درد کو اپنے افسانوں میں سمویا ہے ابتدائی کہانوں میں مثالیت پسند اصلاحی نقطہ نظر نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن بہت جلد قومیت اور عوام کی معاشی بدحالی کو اپنا موضوع بنا لیا۔ اپنے اسلوب اور شیریں عبارت اور قلبی وجذباتی کرداروں کی مصوری کے ذریعے اردو کی اہم افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بنالیا۔''

افسانے نگاری کے میدان میں سدرشن نے دیہات کے بجائے شہروں میں رہنے والے متوسط ہندوستانی گھروں کی زندگی اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ انھوں نے شہری زندگی میں پائی جانے والی کشمکش کو بڑے سادہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کے افسانے زندگی کے حقیقتوں کے ترجمان بن گئے ہیں۔ سلطان حیدر جوش کے افسانے نے مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف ایک احتجاج کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ان افسانوں میں مزاح کی لطافت اور طنز کی آمیزش نمایاں ہے۔ مثلاً ہاں نہیں جواب وخیال اور عالم ارواح ان کا کامیاب افسانے ہیں۔

ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم کا نام بھی قابل تعریف ہے انھوں نے اردو افسانے کو رومانیت پسند سے آشنا کی۔ یلدرم انشائے لطیف کے علمبردہ اپنی مترنم عبارتوں سے بڑھنے والوں کو مسحور کردیتے ہیں۔ جہاں پھول کھلتے ہیں ایک سے التجا میں چاہتا ہوں تلوپطرہ قاہرہ کو دیکھ اور ویرانے صنم خانے ان کے کامیاب افسانے ہیں۔ کے نیاز فتح پوری اور حجاب امتیاز علی کے افسانے میں بھی رومان پسندی کا رجحان نمایاں ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں سکون وخاموشی کے بجائے اضطراب اور ہیجان کی فضا ملتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کو افسانوں شعریت، لطیف احساسات اور رنگینی تحلیل سے بہت زیادہ دلچسپ اور رنگین بادیتے ہیں۔

دیگر افسانہ نگاروں نے طنز ومزاح کو اپنے افسانوں میں جگہ دی اور اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس پردے میں زندگی کی سنجیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کیا۔ ان افسانہ نگاروں میں عظیم بیگ چغتائی اور پطرس بخاری کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ عظیم بیگ کی ظرافت کی بنیاد زندگی کے سیدھے سادے واقعات پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے سامنے افسانوں کے ذریعہ عوامی مذاق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

۱۹۳۰ء کے بعد اردو افسانے کو روسی، فرانسیسی، انگریزی، اور جاپانی زبان کے افسانوں کے ترجموں سے بڑی وسعت ملی۔ ان ترجموں نے اردو افسانہ نگاروں کو بھی متاثر کیا اور انھیں موضوع کے انتخاب پلاٹ کی تعمیر، ڈرامائی اختتام، تکنیک کے تنوع اور مقصدیت کے طرف متوجہ کیا۔ ذہنوں میں وسعت پیدا ہوئی۔ تو اپنے حال سے بے اطمینانی کا شدید اظہار کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والی فرسودہ روایات کے خلاف گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اس نا آسوگی اور گھٹن کا اظہار ۱۹۳۳ میں انگارے کی شکل میں ہوا۔ یہ سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی، محمد ظفر کے افسانوں کا مجموعہ تھا۔ ان مین رومانی انقلاب پسندی، مذہبی، سماجی تنقید، جدید نفسیاتی معنویت، جنسی گھٹن اور ڈیرملوب کی آمیزش ہے۔ ان افسانوں میں موجودہ عہد کی شخصیتوں اور ذہنوں کی تیکھی تصویر میں تلخ طنز اور شدید احساس نے کہیں کہیں سنجیدگی اور ادبی اشاروں کے طرز سے انحراف کرتے ہوئے تمسخر جھنجھلاہٹ اور ابتدال کی شکل اختیار کر لیا ہیں۔ چونکہ یہ مجموعہ حکومت حکومت کی نظر میں ناپسندیدہ تھا۔ اسے چند مہنے بعد ہی ضبط کر لیا گیا

پریم چند اور ''انگارے'' کے مصنفین نے جس منزل تک افسانے کو پہنچایا وہاں سے ترقی پسند تحریک مسائل کو پیش کرنے کے لئے اسلوب وفن کے نئے پیرائے ایجاد کئے اور اردو افسانے کی ایک نئی روایت تشکیل کی جس میں رومانی افسانوں نگاروں کے لیے پیراوں کو ایجاد کیا۔ آزاد خیالی، آرزومند پریم چند کی دردمندی وحقیقت نگاری اور انگارے کے افسانے کو روشناس کرایا۔ ان افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، خواجہ عباس، سہیل عظیم آبادی منٹو وغیرہ کے نام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں۔ افسانہ نگاروں میں سب سے قدرآور شخصیت کرشن چندر کی ہے۔ کرشن چندر نے اپنے عہد کے نمائندگی حقیقت کو اسلوب کی فطری رعنائی میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی جذباتی، رنگین، شیریں اور جاندار زبان میں زندگی کے درد و کرب کو موضوع بنا دیا ہے۔ خاص طور سے سماج کے ستائے ہوئے طبقات کے مسائل بڑے دردناک انداز بیان کرتے ہیں۔'' نظارے''، ''زندگی کے موڑ''، ''ٹوٹے ہوئے تارے، ان داتا، تین گنڈے، اجنتا سے آگے، ہم وحشی ہیں، دل کی کا دوست وغیرہ کے افسانے تحریر کیے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کو افسانہ نگاری کے میدان میں ایک اہم مقام حاصل ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا گہرا مشاہدہ اور انسانی نفسیات وفطری افسانوں کا عمیق مطالعہ پایا جاتا ہے۔ ان کہانیاں اپنے اندر فنی قدرت، ذہانت، اور سماجی شعور رکھتی ہیں۔ اور ذہن پر دیرا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ افسانوں تانے بانے میں غم کی زیریں لہریں ہمارے دلوں میں ایک کسک پیدا کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اچھی کہانیوں کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ سے انداز ہوتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کی روایت کی وسعت نہیں بلکہ نئی جہتیں عطا کیں۔ اور اپنے تجربوں سے افسانوں کے اکہرے پن کو دور کیا۔ آخری کوشش ''ڈھائی سیر آٹا'' سہارے کی تلاش، کمزور پوا، بھرے بازار، وغیرہ ان کے فن کے نادر نمونے ہیں۔

سعادت حسن منٹو بھی ترقی پسندوں کی افسانہ نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں، طوائف اور سماج کے گرے ہوئے لوگوں کی زندگی کو اپنی زندگی موضوع بنایا ہے۔ اپنے کرداروں کی جتنی اچھی تصویر کشی منٹو نے کی ہے کسی اور افسانہ نگار کی بیان سے مل سکے۔ ان کی حقیقت نگاری اکثر فحاشی وعریانی تک پہنچ جاتی ہیں۔ نیا قانون،

کالی شلوار، موذیل، ٹھنڈا گوشت، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور پھندے وغیرہ ان کے مشہور افسانے ہیں۔

عصمت چغتائی نے اپنے تحریر کردہ افسانوں میں مسلمانوں گھرانوں کی اخلاقی، معاشی، اور ذہنی زندگی کی بہترین تصویروں پیش کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عام معاشرتی اقدار و سماج کے جارحانہ روایہ کو اپنے انداز میں حقیقت پسندی سے تحریر کیا ہے۔ عصمت کی بیباک حقیقت نگاری کا ترجمان ہے۔ کلیاں چوئیں، ایک بات، چھوٹی موٹی، دو ہاتھ وغیرہ ان کی کہانیوں کے کامیاب مجموعے ہیں خواجہ احمد عباس زندگی کی تعبیر صرف ترقی پسند نظریات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ سیاسی مسائل اور سیاسی الجھنیں ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ ان افسانوں نگاروں کے علاوہ اوپیندر ناتھ اشک، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد رفرقہ وارانہ واقعات کے جو مناظر پیش آئے ان کے دردناک تصاویر ہمیں اردو افسانوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ خاص طور پر سے قرۃ العین حیدر، منٹو، انتظار حسین اور قدرت اللہ شہاب نے بہترین انداز میں قتل و غارت گری اور بہمانہ درندگی کی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں نے بھی ان واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں مہندر ناتھ، ہاجرہ، مسرور، خدیجہ مستور، عابد سہیل اور آغا سبیل وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے ان نئے افسانہ نگاروں کے یہاں حقائق منکشف طور پر نظر آتے ہیں۔

آج کے اس جدید دور میں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ علامتی افسانہ نگاری کے افسانے کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ ان افسانوں میں عدم تحفظ، تنہائی، بے بسی یقینی ذات کی گمشدگی اور بھری دنیا میں تنہا ہونے کے احساس جیسے موضوعات کو سمویا گیا ہے۔ یہ افسانے پرانے افسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ تجربے کے نام پر موجودہ افسانوی ادب میں فنی اعتبا سے کچھ ناقص افسانے ضروری شامل ہو گئے ہیں۔ کچھ افسانے کی کہانی میں کہانی پن کا فقدان ہے، بعض افسانہ نگاروں نے زندگی کی نئی معنویت کے اظہار میں فن کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

3.3.5 افسانہ کے فنی لوازم

۱) کردار نگاری :

کردار نگاری افسانے کی اہم بنیادی ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر افسانے میں کرداروں سے رمزیت اور ایمائیت (اشاروں) کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر ایسے افسانے بھی تخلیق کئے گئے ہیں جو صرف ایک خاص کردار کے اردگرد گھومتے ہیں، اس لئے کرداروں کے چناؤ میں افسانہ نگار کو بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ جس نوعیت کا کردار ہو، اس سے ویسے ہی مکالمے کہلوانے چاہئیں، یہ نہ ہو کہ کردار ایک موچی کا ہو اور اس سے باتیں دانشوروں کی کہلوائی جائیں، کردار ایک پاگل کا ہو اور وہ باتیں عقلمندوں جیسی کرتا پھرے۔

۲) جزئیات نگاری:

جزئیات نگاری بنیادی طور پر افسانے کا وصف ہے مگر افسانے میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جزئیات نگاری کسی کردار یا منظر کی وہ چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا خامیاں ہوتی ہیں، جس سے عام قاری ناواقف ہوتا ہے۔ جیسے ایک خالی کمرے میں چھوٹی

چھوٹی جزوی چیزیں اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ جزئیات نگاری سے ہی منظر نگاری جڑی ہوتی ہے۔ جزئیات نگاری کے لئے غلام عباس کے افسانے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

3.4 خلاصہ

اردو میں افسانہ مغرب سے آیا ہے۔ افسانے کے فن پر بات کرتے ہوئے مغربی نقادوں نے اپنی اپنی رائے کی ہیں جس میں مثال کے طور پر ''ایڈگر ایلیمن پو'' کا کنا ہے کہ:

''یہ ایک نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں ہمیں آدھے گھنٹے کا وقت لگے۔''

اسی طرح ایک اور مغربی نقاد اور مصنف ''سنڈی اے موسلے'' نے افسانے کی تعریف اس طرح کی ہے۔

''افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو پڑھنے میں پندرہ منٹ سے بیس منٹ تک کا وقت صرف ہو۔''

افسانہ میں پلاٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ نظم وضبط ایک دوسرے کے ساتھ تال میل کا ہونا ایک اچھے افسانے کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔۔ پلاٹ کے متعلق کہا جائے تو بہت سے ناقدین کے رائے یہ ہے کہ واقعات میں ربط اور تسلسل ہونا ضروری ہوتا ہے۔۔ اور آخر میں ایک منطقی انجام پر ختم ہوسکیں۔ اس نظریے میں کلاسیکی اثرات نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مختصر افسانوں میں کرداروں کے ارتقائی کیفیت کی تفصیل نہیں ہوتی اس لیے ظاہر ہے اس میں پلاٹ کسی نہ کسی صورت میں ہونا چاہیے۔ افسانے میں تمہید یا آغاز کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ چیز قاری کو پورا افسانہ پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر تمہید خوبصورت اور جاندار نہ ہو تو قاری افسانے میں دلچسپی ہی نہ لے گا۔ اس لیے افسانے کا آغاز ایسا دلچسپ اور جاندار ہونا چاہیے کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے اور افسانہ پڑھنے پر مجبور کردے۔ پلاٹ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ ایک دوسے میں تسلسل دیکھائی دے۔ افسانہ پڑھنے والے کو افسانہ غیر فطری اور غیر منطقی نہ لگے۔ افسانے کے متعلق خیال یہ تھا کہ اس کا انجام قاری کو چونکا دے۔ اچانک کچھ اس قسم کی بات یا واقعہ ہو جو افسانے کا رخ یکسر موڑ دے قاری کو حیران کن صورتحال کا سامنا کرنا پڑے۔ اردو میں اس حوالے سے ''سعادت حسن منٹو'' کا نام آتا ہے جن کے افسانے نہایت عمدہ اور زندگی کی عکاسی پیش کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔

افسانہ میں زندگی کے دونوں رخ کی جھلک ملتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے افسانے میں زندگی کے مسائل اور مسائل میں گذرنا سکھاتا ہے۔ اسی طرح کے عکس کو پیش کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔ افسانے میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، فنی ترتیب، آغاز، انجام اور مناظر اور جذبہ واحساس ایسے عناصر ہوتے ہیں۔ جو افسانے کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔

☆ **ذیل کے چند نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔**

۱) اختصار : مختصر افسانہ ادب کی وہ صنف ہے، جس کی اپنی ایک فنی ترتیب، جمالیاتی اصول، معیار اور قدریں ہوتی ہیں اور افسانہ اپنی ان ہی اصولی قدروں سے پہچانا جاتا ہے۔ غیر ضروری لفاظی اور کاریگری دکھانے کے شوق میں اکثر افسانہ نگار ضروری طوالت کا شکار ہو کر افسانے کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔

۲) پلاٹ: پلاٹ افسانے کا اہم حصہ ہوتا ہے۔اس میں یعنی اچھے افسانہ میں پلاٹ کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔اس کے بغیر افسانہ مکمل نہیں ہوسکتا۔۔دوسرے لفظوں میں پلاٹ کہانی کی ترتیب کو کہتے ہیں،اوراس ترتیب کے بغیر افسانے میں افسانویت باقی نہیں رہتی۔

۳) قصہ: افسانہ میں قصہ درقصہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔اور پڑھنے والے کے ذہین میں با آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔غیر ضروری باتوں سے اس میں پریز کرنا چاہے۔واقعہ کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہونی چاہیے۔اس لیے افسانہ میں قصہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۴) وحدت تاثر: مختصر افسانے کی صنف میں سب سے نمایاں خوبی اس کے تاثر کی وحدت ہے۔افسانہ جو ایک خیال، ایک وقتی کیفیت،واقعہ یا کسی لمحاتی صورتِ حال سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔

۵) نقطہءعروج: افسانے کو نقط ءِعروج پر پہنچا کر اسی جگہ پر اس کا مناسب اختتام کرنا ہوتا ہے کہ لفظوں میں افسانے کا نقط ءِعروج ہی اس کا اختتام ہوتا ہے،مثلاً الف لیلہ جیسی کہانیوں کا اختتام کتنے دلچسپ انداز سے ہوتا ہے۔

۶) اسلوب: واقعاتی افسانے کے فن میں اسلوب بہت اہمیت کا حامل ہے۔اکثر افسانوں میں صرف ایک لفظ یا کسی مخصوص جملے پر ہی افسانے کی کل اساس ہوتی ہے۔اورالفاظ کے بروقت استعمال سے افسانے کا مفہوم بدل جاتا ہے۔

۷) ذاتی مشاہدہ اور تجربہ : اس حصہ میں افسانہ نگار اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر نہیں ہے۔اور یہی وصف کسی بھی افسانہ نگا اعلیٰ مقام کی طرف لی جاتی ہے۔افسانہ کے فنی لوازم کی اگر بات کی جائے تو ہمیں افسانہ میں شامل ضروری لوازمات جیسے کردار نگاری اور جزیات نگاری کا ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔اس کے بغیر افسانہ مکمل نہیں ہوسکتا۔

3.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات تحریر کیجیے۔

(۱) افسانے کی اہمیت بیان کیجیے؟

(۲) افسانے کے فن پر روشنی ڈالیے؟

(۳) افسانے کے فنی عناصر تفصیل سے تحریر کیجیے؟

(۴) افسانہ نگاری پر مضمون تحریر کیجیے؟

3.6 فہرہنگ

الفاظ	:	معنی
افسانہ	:	مختصر کہانی
پلاٹ	:	افسانہ کا قصہ
مقالمہ نگاری	:	زبان و بیان
اجزائے ترکیبی	:	اجزاء
فن	:	مہارت
صنف	:	قسم

3.7 شفارش کردہ کتابیں

۱) ہمارے پسندیدہ افسانے ڈاکٹر اطہر اردو نثر
۲) نمائندہ مختصر افسانے مرتبہ محمد طاہر فاروقی
۳) اردو افسانے، انشائے اور ڈرامے محمد قاسم صدیقی
۴) اردو کے تیرہ افسانے مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز
۵) تاریخ اردو ادب نورالحسن نقوی
۶) اردو افسانے کا سفر دیہات سے شہر تک ڈاکٹر بلقیس بیگم

☆☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۴ : اردو تنقید

اکائی کے اجزاء

4.1 مقاصد
4.2 تمہید
4.3 موضوعات
4.3.1 تنقید کی تعریف۔مفہوم
4.3.2 تنقید کی اہمیت
4.3.3 تنقید کے اصول
4.3.4 مشرقی تنقید
4.3.5 مغربی تنقید
4.4 خلاصہ
4.5 نمونے کے امتحانی سوالات
4.6 فہرہنگ
4.7 شفارش کردہ کتابیں

4.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔۔۔

☆ تنقید کی تعریف اور مفہوم واضح کرسکیں گے۔
☆ تنقید کے اصول بیان کرسکیں گے۔
☆ اردو تنقید نگاری میں مشرقی اور مغربی تنقید کا جائزہ لے سکیں گے۔

4.2 تمہید

اردو کے ابتدائی شعراء سے تا حال شاعر و ادیبوں میں تنقیدی شعور ملتا ہے۔اردو میں بیاض نویسی ،تذکرے،دیباچے اور اساتذہ شعراء کی اصلاحیں اردو تنقید کا سرمایہ ہیں۔انسان کی فطرت میں کسی شئے کو پرکھنے اور کھرے کھوٹے کو پہچاننے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔چونکہ ادب بھی انسان ہی کی تخلیق ہے۔اور دوران تخلیق ہی سے انسان کا تنقیدی شعور برسرکار رہتا۔موضوع کے انتخاب سے لے کر فن پارے کی تکمیل تک وہ تنقیدی شعور سے گزرتا ہے جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تخلیق وتنقید کے درمیان رشتہ بنیادی ہے۔اس رشتہ کو سمجھنے کی وجہ سے تنقید کو دوسرے درجہ کی چیز سمجھا گیا اور اسے تخلیق کے مقابلے کم اہمیت دی گئی۔اس اکائی میں تنقید کی

تعریف مفہوم اور تنقید کے بنیادی پہلوؤں سے بحث کی جائے گی اور اس کا عمومی جائزہ لیا جائے گا۔

4.3 موضوعات

4.3.1 تنقید کی تعریف۔مفہوم

(۱) تنقید کی تعریف:۔

کسی ادب پارے یا فن پارے کے خصائص اور ان کی نوعیت کا تعین کرنا۔معائب تلاش کرنا یا پھر فن پارے کے کھرا یا کھوٹا پرکھنے کا عمل تنقید کہلاتا ہے۔

(۲) تنقید کا مفہوم:۔

تنقید کے لغوی معنٰی کھرے کھوٹے کی پرکھ کرنا ہے۔ ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں۔ایک کھرا دوسرا کھوٹا۔بعض دفعہ چیز کا کھرا پن فوری نظر آجاتا ہے اور کھوٹا پن ڈھونڈنے پر ظاہر ہوتا ہے۔جس کی نظر تیز ہوتی ہے وہ دونوں پہلوؤں کو بہ یک ایک نظر دیکھ لیتا ہے ۔ ہر آدمی اپنی ضروریات کی چیزوں کو پرکھ کر ہی خریدتا ہے۔مثلاً اگر ہم بازار میں چلے جائیں اور سبزی ترکاری سے لے کر کوئی بھی چیز خریدنی ہو تو ہم اس چیز کو دیکھ کر اس کی اچھائی کو پرکھ کر ہی خریدتے ہیں۔کوئی کپڑا خریدنا ہو تو اس کا رنگ ڈیزائن سوت دیکھ کر پسند کرتے ہیں۔اسی انتخابی عمل یا پرکھ کو تنقید کہا جاسکتا ہے۔

4.3.2 تنقید کی اہمیت

یوں تو ہر انسان میں پرکھ یا تنقید کا تھوڑا بہت شعور موجود ہوتا ہے۔یہ تمام انسان کی نمو پذیر فطرت کا کھیل ہے کہ ہم زندگی کو انقلاب اور تبدیلیوں سے ہم آغوش اور ہم کنار پاتے ہیں اور قدم قدم پر ہمیں اس بات کا احساس ہوتا رہتا ہے۔زمانے کی تغیر پذیری انسانی ادراک کو جلا بخشتی ہے۔

انسان اپنی زندگی کو خوش حال بنانے اور خوب سے خوب تر زندگی گزارنے کے لئے اپنی ناکامیوں اور خامیوں کو دور کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔اپنی خامیوں کا پتہ لگانا ان کی اصلیت معلوم کرنا اور پھر اسے درست کر کے صحیح راستے پر لانے کا عمل ہی تنقید ہے۔

تنقید کا وجود زندگی کے لئے ضروری اور اہم ہے۔اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ ہوگی یا برائیوں کو اچھائی میں تبدیل کرنے کا خیال نہ آئے گا تو پھر وہ اپنی زندگی کو خوشگوار نہیں بنا پائے گا۔کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ زندگی کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنے میں تنقید معاون و مددگار ہوتی ہے۔تنقید کے بغیر زندگی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔اس سے تنقید کی اہمیت اپنے آپ ہی اہم ہو جاتی ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کا قول ہے کہ تنقید ہماری زندگی کے لئے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی کے سانس۔یعنی زندہ رہنے کے لئے تنقید اور تنقیدی شعور کا ہونا لازمی ہے۔یہ تنقید ہی ہے جو زندگی کے صحیح اور غلط راستوں کے فرق کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے۔یہ بات بھی

اپنی جگہ مسلم ہے کہ تنقید ذہنی صحت کا معیار قائم کرتی ہے۔تنقید کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ عوام وخواص میں ادب کا ذوق پیدا کرتی ہے۔بقول عبادت بریلوی ''تنقید کا ایک بڑا کام ادبی اور فنی ذوق پیدا کر کے عوام کے ذوق میں نکھار پیدا کرنا اور ان کے معیار فن و ادب کو بلند کرنا بھی ہے۔''

عمدہ تنقید کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ بیک وقت کئی کام کرتیہے۔آل احمد سرور لکھتے ہیں ''اچھی تنقید معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔''

ہڈسن نے تو تنقید کو تخلیق کا درجہ دے رکھا ہے۔اس کے مطابق ''سچی تنقید بھی چوں کہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے ۔اسلئے اپنے رنگ میں وہ بھی تخلیق ہی ہے۔لہٰذا تنقید کی ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

4.3.3 اردو تنقید کے اصول

علم کی ہر شاخ پر مفصل گفتگو کرنے سے پہلے اس کے اصولوں پر بات کرنا ایک منطقی فعل ہے۔یعنی یہ بات انتہائی فطری ہے کہ انسان کسی سنجیدہ موضوع پر بات کرنے سے پہلے اس کے اصولوں پر بات کرے تا کہ اس علم کی نوعیت کا تعین ہو جائے۔ہم یہاں تنقید کے کچھ عمومی اصولوں پر بحث کرنے جا رہے ہیں۔دنیا بھر کے بہت سے اہم نقادوں نے تنقید کے اصولوں کا تعین کرنے میں اپنی رائے پیش کی ہے۔ہم سب سے زیادہ مناسب بات یہ سمجھتے ہیں کہ اردو تنقید کے اصولوں پر بات کرنے سے پہلے اسلوب احمد انصاری کے مندرجہ ذیل الفاظ کی روشنی میں ان اصولوں کی تعریف بیان کریں۔وہ کہتے ہیں۔''زیادہ اہم کام تو تنقید کے اصولوں کا بنانا اور ان کے قاعدے کی ساتھ پیش کرنا ہے کیونکہ اس سے ادب کو پوری طرح سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اور چوں کہ ان اصولوں کی بنیاد تفکّر اور سوچ پر رکھی جاتی ہے اس لئے ادبی دنیا میں وہ کافی وزن بھی رکھتے ہیں۔چنانچہ کسی صورت میں بھی ان (اصولوں) کو سائنس اور فلسفے سے کم مرتبہ نہیں سمجھا جا سکتا۔''

ہمیں مطالعے کے بعد یہ بھی علم ہوتا ہے کہ تنقید کے اصولوں کا تعین سب سے پہلے یونانی فلسفیوں سقراط، ارسطو اور افلاطون نے کیا تھا۔ہمیں یونانی فلسفہ تنقید کے مطالعے سے یہ علم ہو جاتا ہے کہ دورِ قدیم میں بھی یونانی تہذیب وثقافت اتنی ترقی تافتہ ہو چکی تھی کہ وہ جمالیات اور تنقید کے بنیادی سوالات پر غور کرنے کی منزل تک پہنچ چکی تھی اور یونانی ادب میں تخلیق کا اتنا ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا کہ اس کے تجزیہ اور تحلیل کا کام شروع کیا جا سکے۔حالانکہ تنقید کے یونانی اصولوں کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تنقید کے ان اصول وضوابط کے تعین میں یونان کے معاشرے اور اس ملک کی اپنی روایات کو بھی دخل تھا۔بقول پروفیسر محمد حسن ''گویا ادبی تنقید کے اصول وضوابط ہمیشہ زمان ومکان (جگہ اور عہد) اور معاصر ادب پاروں سے متعین ہوتے آئے ہیں اور غالبًا ایسے کسی ضابطے یا اصول کا تصور ممکن نہیں جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو اور ہر دور اور ہر علاقے کے ادب پر یکساں طور پر منطبق ہو سکے۔'' (تنقیدی تصورات کی تاریخ) سقراط ہمارے لئے اس لئے اہم ہے کہ اس نے افلاطون کی فکری اساس کو نہایت درجہ متاثر کیا تھا۔

4.3.4 مشرقی تنقید

مشرقی تنقید سے مراد اورینٹل Oriental Criticism ہے۔یعنی جغرافیائی اعتبار سے جو ممالک اورینٹل یعنی مشرقی ممالک کہلاتے ہیں، ان ممالک میں چونکہ ادب کی تخلیق کے تلازمے مغربی ادب سے مختلف ہوتے ہیں اس لئے ظاہر سی بات ہے کہ تنقید کے تلازمے بھی الگ ہی ہوں گے۔اس لئے مشرقی تنقید کے تحت ایک الگ باب قائم کیا گیا ہے۔مشرقی تنقید میں خصوصی طور پر عربی تنقید، فارسی تنقید، سنسکرت تنقید کی خدوخال کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ہم اس ذیلی باب میں مشرقی تنقید کے انہی خدوخال کا مطالعہ کرنے جارہے ہیں۔ہمیں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی ہوگی کہ ہندوستانی ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فن تنقید پر مشرقی تنقید کے اثرات مغربی تنقید کے اثرات کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔اس لحاظ سے ہمارے لئے اس باب کا مطالعہ نہایت ضروری ہوجاتا ہے۔ آیئے، دیکھیں کہ مشرقی تنقید ہماری ادبی تخلیقات اور فن پاروں کے لئے کیا درجہ رکھتی ہے اور ہمارے لئے اس کی افادیت کیا ہے۔

4.3.5 مغربی تنقید

زندگی اور دنیا کو سمجھنے کا عمل ایک دانشورانہ عمل ہے۔یہ دانشوری فلسفہ کہلاتی ہے۔تنقید کو بھی فلسفۂ ادب کا نام دیا گیا ہے اس لئے ایک تنقید نگار یا نقاد ایک فلسفی بھی ہوتا ہے۔جب ادب تخلیق ہوتا ہے تو اس کی تخلیق کچھ سوالات پیدا کرتی ہے۔جیسے:

۱۔ادب یا تخلیقی ادب کیا ہے؟

۲۔تخلیقی ادب دوسری تحریروں سے الگ کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟

۳۔ادب کے سماجی اور فکری سروکار کیا ہونے چاہیئں؟

۴۔تخلیقی ادب میں اجتماعیت اہم ہے یا انفرادیت؟

۵۔تخلیقی ادب کی زبان اور عوامی زبان میں کیا تفاوت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یعنی اس طرح کے اور بھی کئی سوالات ہیں جن سے ایک نقاد کو واسطہ پڑتا ہے۔یہی وہ سوالات ہیں جنہیں سب سے پہلے قدیم مغربی مفکرین نے اٹھایا اور پھر ان کے جوابات بھی دریافت کئے۔یہیں سے مغربی تنقیدی شعور کا آغاز ہوتا ہے۔قدیم یونان اور رومی تہذیب اور تنقیدی روایات کے آغاز کے بعد ایک طویل عرصے تک خاموشی رہی، یہی قدیم روایات مغربی ادبیات پر حاوی رہیں۔ارسطو، سقراط، افلاطون اور ہومر وغیرہ کو ہی ادبی مباحث کے لئے رجوع کیا جاتا رہا۔یہ معاملہ چودھویں صدی عیسوی تک چلتا رہا۔اس کے بعد جب صنعتی انقلاب نے مغرب کے دروازے پر دستک دی اور نشاۃ الثانیہ کا عہد شروع ہوا، تو نئی ادبی تھیوریوں کی شروعات ہوئی۔ تنقید نے بھی اپنا جامہ تبدیل کیا اور شدتِ اظہار کے ساتھ نئی تنقید مختلف ادوار سے گزر کر مغربی تنقید کو مالا مال کرتی رہی۔یہی مغربی تنقید کے نظریاتی فروغ وارتقاء کا نکتۂ اتصال ثابت ہوا۔

4.4 خلاصہ

اس اکائی میں تنقید کی تعریف کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید کے معنی ومفہوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی تنقید کی اہمیت وافادیت

کو اجاگر کیا گیا ہے۔تنقید تخلیق و تحقیق کا تعلق بیان کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر اس اکائی کا عمومی جائزہ بھی لیا گیا تا کہ طلبہ تنقید کے معنی و مفہوم کے ساتھ ساتھ مفکرین کی آراء سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

مشرقی تنقید میں خصوصی طور پر عربی تنقید، فارسی تنقید، سنسکرت تنقید، جاپانی تنقید اور چینی تنقید کے خدوخال کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ہم اس ذیلی باب میں مشرقی تنقید کے انہی خدوخال کا مطالعہ کرنے جارہے ہیں۔ہمیں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی ہوگی کہ ہندوستانی ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فن تنقید پر مشرقی تنقید کے اثرات مغربی تنقید کے اثرات کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

4.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات تحریر کیجیے۔

(۱) تنقید کی تعریف مع مثال کے ساتھ تحریر کیجیے؟

(۲) اردو تنقید کی اہمیت بیان کیجیے؟

(۳) تنقید وہ تخلیق پر تبصرہ کیجیے؟

(۴) اردو تنقید کا مفہوم واضح کیجیے؟

(۵) اردو تنقید پر تبصرہ کیجیے؟

4.6 فہرہنگ

الفاظ	معنی
تمیز کرنا	:فرق پہچاننا
اصطلاح	کسی علمی یا گروہ کا کسی لفظ کے عام معنوں کے علاوہ کوئی خاص مقرر کر لینا۔مرادی معنی
تشریح کرنا	مطلب سمجھانا نا
ناگزیر	:ضروری
فنکار	:ہنرمند
معائب	برائی
محاسن	اچھائی
ترجمان	نمائندہ
یگانگت	ایک جیسے
نقاد	فن تنقید کا ماہر
تجزیہ کرنا	الگ الگ کرنا

4.7 شفارش کردہ کتابیں

۱) روح تنقید	ڈاکٹر قادری محی الدین زد
۲) تنقید کیا ہے؟	آل احمد سرور
۳) ادبی تنقید اصول ونظریات	شاداب ردولوی
۴) اردو تنقید	عبادت بریلوی
۵) ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات۔	گوپی چند نارنگ
۶) سخن دانِ فارس۔	محمد حسن آزاد
۷) اردو تنقید سب کے لئے	ڈاکٹر بلقیس بیگم

☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۵ : ڈرامہ نگاری

اکائی کے اجزاء

5.1 مقاصد
5.2 تمہید
5.3 موضوعات
5.3.1 ڈرامے کی تعریف
5.3.2 ڈرامہ کا فن
5.3.3 اردو میں ڈرامہ نگاری کا ارتقاء
5.3.4 ڈرامے کی قسمیں
5.4 خلاصہ
5.5 نمونے کے امتحانی سوالات
5.6 فہرہنگ
5.7 شفارش کردہ کتابیں

5.1 مقاصد

5.2 تمہید

کسی ملک اور کسی عہد کی قدیم تہذیب کو سمجھنے کے لئے وہاں کے ادب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔اس اعتبار سے صنف ادب میں ڈراما بھی اہمیت کا حامل ہوجاتا ہے۔اس صنف کے ذریعہ معاشرت کی عکاسی ہوتی ہے جس میں اس کی تصنیف عمل میں آئی۔اردو ڈرامے کی وجود میں آئے تقریباً دوسوسال ہوچکے ہیں۔اس مختصر سے عرصے میں اس نے عروج وزوال کی کئی منزلیں طے کیں۔نواب واجدعلی شاہ کے زمانے تک اردو ڈرامے کا باقاعدہ وجود نہیں تھا۔اس اہم صنف ادب کی ابتدا نواب واجدعلی شاہ نے کی۔انھوں نے اپنی کم سنی میں ہی ''رادھا کتھا کے رہس'' پر ایک چھوٹا سے ناٹک لکھا۔یہ ڈراما فنی اعتبار سے کم زور ہونے کے باوجود اردو کا پہلا ڈراما ہونے کی حیثیت سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔اس اکائی میں ڈرامے کے فن، تکنیک اور عناصر ترکیبی کو بھی متعارف کرایا گیا ہے۔تاکہ طلبا اسٹیج ڈراما کے فنی ''لوازم کو سمجھ سکیں۔قدیم ہندوستانی ڈراموں کا مختصر سا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ اردو ڈرامے کے خدوخال سمجھنے میں آسانی ہو۔

5.3 موضوعات

5.3.1 ڈرامے کی تعریف :

ڈراما ایک ایسی صنف ہے جس میں تمام فنون لطیفہ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔مثلاً موسیقی، رقص، ایکشن، وغیرہ۔یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جو انسان سے جڑی ہوئی تمام باتوں کا احاطہ کرتی ہے۔ڈراما یونانی لفظ 'ڈراؤ' سے نکلا ہے۔جس کی معنی ہیں 'کسی کام کو عملی طور پر کر کے دکھانا'۔ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر کشی ہے۔بقول نیکول (NICOLL) '' ڈراما انتہائی سنسنی خیز فن ہے'' ایک اور جگہ نکول نے اپنی کتاب ''دی تھیوری آف ڈراما'' میں ڈرامے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"Drama is a copy of life, a mirror of custom, a reflection of truth"

'ڈراما دراصل زندگی کی ہو بہو نقل ہوتا ہے۔'

لیکن کولرج ڈرامے کی تعریف یوں پیش کرتا ہے۔

"Drama is not a copy but on Imitation of nature"

''یعنی ڈراما حقیقت کا اتار نہیں بلکہ فطرت کی نقالی ہے۔''

5.3.2 ڈرامہ کا فن

ڈراما کا فن ایک مشکل فن ہے۔اس میں ادبی صلاحیتوں کے ساتھ اسٹیج سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔اصناف ادب میں ڈراما کو مقبولیت حاصل ہے۔دونوں کے اجزائے ترکیبی ایک ہونے کے باوجود کئی بنیادی فرق بھی ہیں۔ناول اور ڈراما میں واقعات اور اشخاص ضروری ہوتے ہیں۔کہانی کے واقعات کسی ایک یا چند اشخاص کے ساتھ پیش آتے ہیں اور لکھنے والا واقعات اور کرداروں کو ایک مخصوص نقطہ نظر کے تحت ترتیب دیتا ہے۔زندگی کے متعلق مصنف کا ایک مخصوص زاویہ نظر ہوتا ہے، اور یہی زاویہ واقعات اور کرداروں کی پیش کش میں مصنف کی رہنمائی کرتا ہے۔یہ ساری چیزیں ڈرامے اور ناول کے مشترک عناصر ہیں لیکن فن کے نقطہ نظر سے دونوں کے عناصر کی اہمیت ایک جیسی نہیں ہوتی کیونکہ ناول اور ڈراما کا بنیادی فرق یہی ہے کہ ناول پڑھے جانے کے لئے لکھا جاتا ہے اور ڈراما عملی طور پر کر کے دکھائے جانے کے لئے۔جو چیز عملی طور پر کر کے دکھانے یا اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے اس کے لئے مصنف کو کئی باتیں پیش نظر رکھنی پڑتی ہیں۔مثلاً کسی چیز کو اسٹیج پر پیش کرنے میں اتنا زیادہ وقت نہ لگے کہ دیکھنے والے بیٹھے بیٹھے تھک جائیں یا پھر اکتا جائیں۔مصنف کا یہ کمال ہوتا ہے کہ ایک ڈراما میں شروع سے آخر تک اتنی ہم آہنگی ہو کہ دیکھنے والوں کی دلچسپی اور توجہ میں فرق نہ آنے پائے۔

صنف ڈراما میں سب سے اہم پابندی وقت کی ہوتی ہے یعنی ڈراما لکھنے والا کسی بڑے سے بڑے مسئلے کے متعلق بھی کچھ لکھنا چاہتا ہے تو اسے اپنی ساری بات اتنے لفظوں میں ادا کرنی پڑتی ہے کہ اس کا ڈراما ڈھائی سے ساڑھے تین گھنٹے میں اسٹیج کیا جا سکے۔اس مختصر وقت میں ایک ڈراما نگار کے لئے لازم ہے کہ وہ پلاٹ اور اچھے کردار نگاری کو پیش نظر رکھے۔اس کی کہانی کا پلاٹ پیچیدہ ہونے

کے بجائے سادہ ہو،صداقت اور حقیقت کا مظہر ہو۔زندگی کا ترجمان ہونے کے باوجود جدّت کا حاصل ہو اور دلچسپ بھی ہو۔اس کے پیش کردہ کرداروں میں نہ عمومیت ہو نہ مثالیت۔ بلکہ وہ زندگی کا صحیح نمونہ معلوم ہوں۔ایک قسم کی انفرادیت ان کی رفتار اور گفتار سے ظاہر ہو۔جس مسئلے پر ڈرامے کا موضوع اور پلاٹ کی بنیاد ہو وہ ڈرامے کے واقعات اور کرداروں کی گفتگو سے واضح ہوتا رہے۔اور ڈراما ختم ہوتے ہی دیکھنے والوں پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جائے،ڈراما نگار کو ایک ناول نگار کی طرح اپنے الفاظ سے کسی خاص منظر کو تفصیل سے بیان کرنے اور ہر چھوٹے بڑے پہلو کو ناظر کے سامنے پیش کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہوتی ہے۔اسے ایک مخصوص کینوس پر کام کرنا ہوتا ہے۔

بیان کی وہ آزادی جو ناول نگار کو پلاٹ کی پیش کش،کرداروں کی مصوری،منظر نگاری یا نقطۂ نظر کی وضاحت اور اظہار میں قدم قدم پر حاصل ہے۔ڈراما نگار اس سے تقریباً محروم ہوتا ہے۔مگر اس بیانیہ اظہار کی تلافی وہ پلاٹ کی فنّی ترتیب اور کردار نگاری سے کرتا ہے ڈراما نگار کو پلاٹ کی ترتیب اور مختلف اجزا میں ربط اور آہنگی پیدا کرتے وقت بڑے اختصار اور ایجاز سے کام لینا ہے،اس کے مکالمے پلاٹ کو آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں،اور کردار واقعات کی وضاحت کرتے ہیں۔وہ کرداروں کی گفتگو اور ان کی حرکات و سکنات سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے۔ہم ڈرامے کی عظمت کا اندازہ واقعات کی دل کشی اور ان کے انوکھے پن سے نہیں بلکہ کرداروں کی عظمت وشکوہ یا ان کی ناقابل فراموش انفرادیت سے لگاتے ہیں۔جس طرح ہم کسی غیر معمولی شخص سے ملنے کے بعد مدتوں اور بعض اوقات ہمیشہ اسے یاد رکھتے ہیں۔غرض یہ کہ ایک ڈراما نگار کو پلاٹ کی ترتیب،کرداروں کی پیش کش،اور نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے ایک مختلف راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔وہ حقیقت اور صداقت کی جستجو میں حقیقت کی راہ سے انحراف کو فن ڈراما نگاری کا ایک لازمی حصہ سمجھتا ہے۔اس کی ساری توجہ تماشائی کے لئے سرور وانبساط مہیا کرنے پر ہوتی ہے۔اور یہ سرور صرف ادبی اور فنی تخلیقات کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔اب یہ سہولتیں ڈرامے کی فن کی روایت کا حصہ بن گئی ہیں۔اور انھیں سہولتوں کو ڈراما کے فن کا نام بھی دیا گیا ہے۔

5.3.3 اردو میں ڈرامہ نگاری کا ارتقاء

نواب واجد علی شاہ نے اپنی کوششوں سے صنف ڈراما کی بنیاد رکھی۔انھیں اردو کے اوّلین ڈراما نگار اور اسٹیج کے بانی حیثیت سے ہمیشہ اہمیت اور اوّلیت حاصل رہے گی۔ان کی ذاتی نگرانی میں لکھنؤ کے قیصر باغ میں جو ''رہس'' یا ''رام لیلا اور کرشن لیلا'' کھیلی جاتی تھیں۔ان کی شہرت نے نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کے کھیل،لیلائیں یا تمثلیں کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔چنانچہ اودھ میں شاہی ''رہس'' کی ترتیب اور پیش کش کا حال سن کر امانت لکھنوی نے ایک ناٹک تیار کیا۔جس میں راجہ اندر اور اس کی سبھا کی ایک سبز پری کا قصہ پیش کیا گیا تھا۔یعنی پری اور ایک آدم آزاد گلفام کی محبت کے نتیجے میں ہونے والی کشمکش کو قلم بند کیا تھا۔پروفیسر احتشام حسین کا خیال ہے کہ امانتؔ کی اندر سبھا پر میر حسنؔ کی مثنوی سحر البیان کا غیر معمولی اثر نظر آتا ہے۔امانتؔ نے پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی گلزار نسیم سے بھی استفادہ حاصل کیا تھا۔اس کے باوجود امانت کی یہ خدمت قابل قدر ہے کہ اردو ڈرامے کے فنی لوازم کو انھوں نے باقاعدہ شکل دی اور اس منظوم قصے کو کامیابی کے ساتھ اسٹیج کے قابل بنایا۔امانتؔ لکھنوی کی تقلید میں بہ یک وقت

اردو ڈراما کا آغاز ملک کے مختلف مقامات پر نظر آتا ہے۔

ممبئی میں اردو ڈرامے کی تاریخ کا وہی عہد متعین کیا جاتا ہے جو ''اندر سبھا'' کے آغاز یعنی 1853ء کا ہے۔ یہاں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مراٹھوں اور پارسیوں نے مراٹھی اور گجراتی ڈراموں کو رواج دیا۔ یہ ڈرامے باقاعدہ اسٹیج پر پیش کئے جاتے اور دیکھے جاتے تھے۔ مراٹھی ڈراموں کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی میں انگریزی تھیٹر کے تعمیر سے ہو یہ تھیٹر ممبئی تھیٹر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ''مراٹھی رنگ بھومی'' کی بنیاد وشنوداس بھاؤ ے نے 1843ء میں رکھی تھی۔ وہ خود بھی ایک اچھے ادار کار، گلوکار اور ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے اپنا پہلا ڈراما شہر سانگلی (اسٹیٹ مہاراشٹر) میں اسٹیج کہا تھا ان کی تقلید میں کئی لوگوں نے مذہبی ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں میں نثر اور نظم دونوں کا استعمال ہوتا تھا۔ وشنوداس بھاؤ نے نہ صرف مراٹھی کے اولین ڈراما نگار تھے بلکہ انھوں نے ممبئی میں سب سے پہلا ڈراما ''گوپی چند جالندھر'' پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی کا خیال ہے کہ نواب واجد علی شاہ کے ''رہس'' یا ''رادھا کنہیا'' کے قصے کو اگر ڈراما اور ان کی کوششوں کو ڈراما نگاری سمجھا جائے تو امانت کی اندر سبھا اور سانگلی (مہاراشٹر) کے ایک مراٹھا ڈراما نویس وشنومہنت بھاوے کے ترتیب دئے ہوئے ہندوستان ناٹک ''راجہ گوپی چند جالندھر'' کا زمانہ تصنیف ایک ہی ہے۔ اور اس کے وافر ثبوت مہیا ہو چکے ہیں۔ کہ وشنوداس بھاوے نے اپنا یہ ڈراما بھاؤ داجی لاڈ سے لکھوا کر بامبے تھیئٹر کے اسٹیج پر 1852ء یا 1853ء میں ممبئی میں پیش کیا تھا۔ اس ڈرامے کا پلاٹ رامائن سے ماخوذ تھا۔ اس کے بعد اس سلسلے میں اردو کا وہ ڈراما جو دستیاب ہوتا ہے وہ ''خورشید'' ہے۔ اس ڈرامے کو بہرام جی فریدوں جی میرزبان نے گجراتی سے اردو میں ترجمہ کر کے 1871ء میں وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے ذریعے پیش کیا تھا۔ اس ڈرامے کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔ اسی زمانے سے اردو تھیئٹر کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈراما خورشید اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں مکالمے نظم کی بجائے نثر میں لکھے گئے تھے۔ اس ناٹک منڈلی نے خورشید کے علاوہ ''نور جہاں'' اور ''الہ دین چراغ'' بڑے اہتمام سے اسٹیج کئے۔ اس منڈلی کی کامیابی کو دیکھ کر دوسری ناٹک منڈلیوں نے بھی اردو ڈراموں کی طرف توجہ کی۔

انیسویں صدی کی ابتداء سے لے اس صدی کے خاتمے تک کئی کمپنیاں وجود میں آئیں اور ختم ہو گئیں۔ اردو کا پہلا ڈراما اسٹیج کرنے والی کمپنی وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے علاوہ الفنسٹن ڈرامیٹک منڈلی، نیو ممبئی تھیئٹر وغیرہ 1880ء تک بڑی کامیابی اور مقبولیت کے ساتھ انگریزی، گجراتی، مراٹھی اور اردو ڈرامے اسٹیج کرتی رہیں۔ ممبئی کے پارسی خود ہی اپنے ڈرامے لکھا کرتے تھے مگر ان کی زبان فصیح اور بامحاورہ نہیں تھی۔ دھیرے دھیرے ان ڈراما کمپنیوں کو اردو ڈراما نگاروں کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کمپنیوں نے ہندو اور مسلمان ادیبوں کو اپنے یہاں بطور ملازم رکھ کر ان سے ڈرامے لکھوانے شروع کئے۔ ان مشہور معروف ڈراما نگاروں میں غلام حسین ظریف، منشی احسن لکھنوی، پنڈت بیتاب دہلوی، منشی ونایک پرشاد، طالب بنارسی، منشی شیخ محمود، رونق بنارسی، میر غلام عباس، منشی محمد علی مراد لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

آغا حشر کاشمیری کو اردو ڈرامہ نگاری کا شیکسپیر کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کئی ڈرمے تحریر کیے۔ ساتھ کئی ڈراموں میں نظم سے زیادہ نثر کا استعمال کیا ہے وہ سماجی مسائل اور زندگی کی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود انھوں نے تماشائیوں کی سطحی مذاق اور تفریح کا خاص طور سے خیال رکھا۔ ساتھ ہی حب الوطنی، ایثار اور ملک کی آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کے جذبات

ہندوستانی عوام کے ذہنوں پر چھا گئے اور ادب میں مختلف اصناف سخن اصناف نظیمں ،مضمون،انشائیے وغیرہ تیزی سے داخل ہوئے۔ چنانچہ صنف ڈراما کو بھی عصری تقاضوں سے سنوارنے کی کوشش ہونے لگیں۔اس دور میں کئی ادباءوں نے بھی ڈرامہ نگاری کو فروغ دیا۔جن میں مثلاً محمد حسین آزاد کا اکبر (1888ء)،مرزا ہادی رسوا کا مرقع لیلا (1887ء) عبدالحلیم شرر کا شہید وفا عبدالماجد دریا آبادی کا زود پشیماں (1917ء) دتاتریہ کیفی کا راج دلاری (1914ء) پریم چند کا کربلا (1916ء) اور چکبست کا کملا (1918ء) وغیرہ ڈرامے وجود میں آئے جن سے ڈرامے کی ادبی قدر میں اضافہ ہوا۔اس کے باوجود ادب میں کوئی ایسا ڈرامانہ لکھا جاسکا جو عالمی شہرت کا مالک ہوتا۔امتیاز علی تاج کا تحریر کردہ ڈراما ''انارکلی'' اردو ادب کا واحد بہترین ڈراما مانا جاتا ہے۔لیکن وہ بھی شیکسپیئر کے ڈراموں کا مقابلہ نہیں کرسکتا کیونکہ تاج نے ڈراما لکھتے وقت اسٹیج اور اس کی فنی لوازمات کو نظر انداز کردیا تھا۔ڈرامے کا اسٹیج سے ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔اسٹیج اور ڈراما ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ہندوستان کے ڈراموں میں مختلف مزاج ومعیار کے لوگ ہوتے ہیں۔کسی کو رقص وموسیقی سے،کسی کو اداکاری سے اور کسی کو مکالموں، پلاٹ یا کہانی سے اور بعض افراد کو منتظر کی دلکشی دیکھائی دیتی ہے۔ نیا دور لاتعداد نئے افکار وخیالات لے کر آیا تھا۔انگریزی تعلیم کے فروغ نے مغربی علوم اور طرز فکر سے ہندوستانیوں کو متاثر کرنا تو پہلے ہی شروع کردیا تھا۔لیکن اب اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی تھی۔انگریزوں کے سیاسی مخالفت شدت سے کی جارہی تھی،نتیجہ تہذیبی،فکری،تعلیمی اور سیاسی ومعاشی اعتبار سے مغربی اقدار کو اتنی ہی شدت سے اپناتے بھی چلے جارہے تھے۔نئے نئے ڈرامے لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔مغربی روایات سے متاثر ہوکر اردو کے چند ڈراما نگاروں نے اردو ڈرامے کو جدید ٹکنالوجی سے روشناس ہوئے۔ان میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر عابد حسین،فضل الرحمٰن،پروفیسر محمد مجیب اور امتیاز علی تاج کی خدمات خصوصاً قابل ذکر ہیں ان ڈرامہ نگاوں نے اصلاح معاشرت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔اس اعتبار سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ''صید زبوں'' ڈاکٹر عابد حسین کا ''پردۂ غفلت'' امتیاز علی تاج کا ''انارکلی'' اور محمد مجیب کا ''آزمائیش'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔1930ء کے بعد ہی انگریزی ادب کے زیر اثر ایک ایکٹ (یک بابی) ڈرامے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) اور پرتھوی تھیٹر نے جدید طرز کے ڈراموں کو پیش کرنے سلسلہ شروع کردیا تھا۔اپٹا نے خواجہ احمد عباس کا ڈراما ''زبیدہ'' اور سرخ گلاب کی واپسی علی سردار جعفری کا ''یہ خون کس کا ہے'' اور بلراج ساہنی کا ''جادو کی کرسی'' پیش کرکے ڈرامے کے جدید رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ 1937ء میں آل انڈیا ریڈیو کے قیام نے اردو ڈرامے کے ارتقا کا ایک اور راستہ کھول دیا۔اور ریڈیو پر اردو ڈراموں کی نشر واشاعت کا سلسلہ چل نکلا۔1950ء کے بعد جن ڈراما نویسوں نے اسٹیج کی دنیا میں تہلکہ مچادیا ان میں حبیب تنویر اور ڈاکٹر محمد حسن قابل ذکر ہیں۔ایپک ڈراما اپنی ہئیت کے اعتبار سے ٹی-وی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔اس لئے ٹی-وی کے اردو ڈرامہ نگاروں نے ڈرامے کی اس ہیئت سے استفادہ کیا۔

5.3.4 ڈرامے کی اقسام

ناٹیہ شاستر میں ڈرامہ نگاری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلی ''روپک'' اور دوسری ''اپ روپک''،سنسکرت شاعری کی بھی دو قسمیں ہیں،ایک ''شرویہ'' (سماعی) اور دوسری ''درشیہ'' (عینی) یعنی ایک وہ جو سنی جاسکے اور دوسری وہ جو دیکھی جاسکے۔صفدر آہ نے

''روپک'' کی دس اور ''اُپ روپک'' کی اٹھارہ قسموں کا ذکر کیا ہے۔ نجوف طوالت ان کی تفصیل سے یہاں اجتناب کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے جدید رائج ڈراموں کو صفدر آہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱) سوشل ڈرامہ (۲) کاسٹیوم ڈراما- انھوں نے سوشل ڈرامے کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں۔ جو اس طرح ہیں۔(۱) فیملی سوشل (۲) ماڈرن سوشل (۳) سوشل ڈرامے (۴) مسلم سوشل۔(۵) ولیج سوشل (۶) سوشل کامیڈی (۷) میوزیکل سوشل (۸) ایکشن سوشل۔ اور کاسٹیوم ڈرامہ کی چار قسمیں بتائی ہیں۔(۱) دھارمک ڈرامہ (۲) تاریخی ڈرامہ (۳) فینسی ڈرامہ (۴) ایکشن ڈرامہ۔ صفدر آہ ادب اور ڈرامے کی دنیا کے ایک جانے پہچانے اور مستند فن کار ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً پچیس سال ڈرامے کی خدمت میں گزارے ہیں۔ اور صنف ڈراما پر ان کی کئی تصانیف موجود ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے قدیم ڈراموں اور نئے ڈراموں کی فنی ضرورتوں کو تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم قریشی (مصنف: ڈراما نگاری کا فن- لاہور ۱۹۶۳ء) نے ڈراموں کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) المیہ (۲) میلوڈراما (۳) طربیہ اور (۴) سوانگ، جب ہم ڈراما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مصنف اپنے گردوپیش کے ماحول کے زیر اثر ڈرامے میں المیہ اور طربیہ قسم کو رواج دیتے رہے ہیں۔ یونان میں عام زندگی میں بے فکری اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ عوام غم والم سے نا آشنا تھے۔ اس لئے وہاں المیہ ڈرامے کو بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے برعکس ہندوستانی ڈرامے اعلیٰ طبقات کے لئے سامان تفریح مہیا کرتے تھے اس لئے یہاں طربیہ ڈراموں کو فروغ حاصل ہوا۔ یونانیوں نے المیہ کے لئے جو اصول وضع کئے تھے۔ آج بھی انھیں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(۱) **المیہ (ٹریجڈی)**: المیہ ڈرامے کا اختتام ناکامی پر ہوتا ہے۔ ان کا پلاٹ غم واندوہ کے واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس میں باوقار اور اعلیٰ کردار اپنی کسی کمزوری کے باعث ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں

(۲) **طربیہ (کامیڈی)**: اس قسم کے ڈرامے کے پلاٹ میں خوشی ومسرت پیدا کرنے والے واقعات ہوں۔ اور اس کے کردار متوسط درجے کے عام انسان ہوں۔ جس سے دیکھنے والوں مسرت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) **المناک طربیہ یا ٹریجڈی کامیڈی**: یہ المیہ اور طربیہ ڈراموں کا ایک اتحاد ہوتا ہے۔ اس میں ڈرامہ نگاروں نے دیوتاؤں کی بہادری کے قصے اور کہانی کے المیہ وطربیہ خوصیات کو ملا ایک نئی قسم ایجاد کی جیسے الم طربیہ کہا گیا۔

(۴) **میلوڈراما**: اس طرح ڈراموں میں گاؤں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں جذباتی انداز کی بہتات ہوتی ہے۔

(۵) **اوپیرا**:۔ اس ڈرامہ کی قسم میں کردار اپنے رقص وسرود کے ذریعے پیش کیا جائے وہ اوپیرا کہلاتا ہے۔ اس میں کہانی کے مطاق موسیقی کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

(۶) **تاریخی یا ہسٹوریکل ڈرامے**: اس میں تاریخ کے اہم اور نمایاں اشخاص کے حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ چند فرضی کردار بھی شامل کر دیئے جاتے ہیں۔

(۷) **سوانگ یا فورس**: ان ڈراموں میں عوامی سطح کے مضحکہ خیز واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ کامیڈی کی ایک ایک طرح کی قسم ہوتی ہے۔ جو دیکھنے اور سننے والوں کو لطف اندوز کرتی ہے۔

(۸) **معجزاتی اور اخلاقی:** اس قسم کے ڈرامے میں قدیم دور میں رائج تھے۔جس میں کسی پیغمبر یا کسی ولی اور سنت سادھو کی زندگی کے واقعات کو پیش کیا جاتا تھا۔

(۹) **خیالی یا فینسی:** ان ڈراموں میں ایسے واقعات پیش کئے جاتے ہیں جو حقیقی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ یہ مخلوط قسم کے ڈراموں کو ایک شاخ کہی جاسکتی ہے۔

عام طور پر ڈرامہ کی دو ہی اقسام بتائی گئی جو درج ذیل ہیں۔

(۱) ٹریجڈی ڈراما (اردو میں اسے 'المیہ' ڈراما کہتے ہیں)

(۲) کامیڈی ڈراما (جسے اردو میں 'طربیہ' ڈراما کہا جاتا ہے)

5.3.5 ڈرامہ کے اجزائے ترکیبی

(۱) پلاٹ

ڈرامے میں پیش کی جانے والی کہانی کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔ڈراما کی زیادہ تر کامیابی کا انحصار پلاٹ یا کہانی کے اصل موضوع پر ہوتا ہے۔اگر بنیاد کمزور ہوتا عمارت کی تکمیل ہی دشوار ہو جاتی ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ پلاٹ کی بنیاد مضبوط اور اس کی تمام کڑیاں چُست و پیوست ہوں۔ پلاٹ کا انتخاب ڈراما نگار کا پہلا کام ہے۔ پلاٹ کے لئے واقعات میں پاکیزگی، دِل چسپی اور جدت وندرت کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۲) مرکزی خیال

مرکزی خیال کی اہمیت ہی ڈراما کو دل چسپ وافادیت سے ہمکنار کرتی ہے۔اس لئے یہ روح ہے اور باقی اعضاء ڈراما کے جسم کے اعضاء ہیں۔مرکزی خیال جتنا سادہ، عام فہم اور پاکیزہ ہوگا اتنا ہی واقعات کا زور واثر نتیجہ خیز و پائدار ثابت ہوگا۔اگر ہم پلاٹ کو عطر تسلیم کریں تو مرکزی خیال روح عطر ہے۔مختصر الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ ڈراما نگار کسی خیال کی بنیاد پر اپنے ڈرامے کا پلاٹ مرتب کرتا ہے اور یہی خیال مرکز کی حیثیت میں مدد دیتی ہے

(۳) آغاز

ڈراما کا آغاز ہی ڈرامے کا چہرہ کہلاتا ہے۔اس میں ڈراما نگار کا فرض ہے کہ پر کیف، باوقار اور دل چسپ اسلوب سے ڈرامے کی ابتداء کرے۔ابتداء میں خلافِ توقع وشوکت قائم نہ کی جائے جسے انجام تک نبھانا مشکل ہو، اور انتی پستی بھی نہ ہو کہ آغاز میں اکتاہٹ اور بے تعلقی کے امکانات پیدا ہوسکیں۔

(۴) کردار

جس طرح ڈراما تشکیل کی کامیابی زیادہ تر پلاٹ اور قصّہ کی اہمیت پر منحصر ہے، اسی طرح قصہ کی کامیابی کا انحصار اس کے کرداروں پر ہوتا ہے۔ پلاٹ کی حقیقت کو واضح کرنے اور واقعات کو فطری رنگ دینے کے لئے کردار نگاری میں پختگی ضروری ہے۔

دراصل ڈراما حرکت وعمل کی سچی تصویروں سے مکمل ہوتا ہے.

(۵) مکالمے

ڈرامہ زندگی کا عمل ہے۔ ہر کردار کے عمل گفتگو کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہی گفتگو یا مکالمہ ڈرامہ کی جان ہے۔ مکالمے عملی صداقت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر کردار کی کامیاب کی ذمہ داری کالمہ پر منحصر ہے۔ مکالمہ کے ذریعہ ہی تمام خیالات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

(۶) تصادم

ماہرین فن نے تصادم کی قوت کو اس قدر اہم تسلیم کیا ہے کہ اس کے بغیر ڈراما کا وجود ممکن نہیں۔ تصادم سے مراد دو قوتوں کا تضاد، اور انکے درمیان کشاکش ہے۔ عموماً تصادم دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(الف) داخلی (ب) خارجی

(۷) نقطۂ عروج

ڈراما دانجام کی آخری منزل تک پہنچانے کے لیے راستہ کی رکاوٹوں، ہموار پیچیدگیوں اور متناسب کشمکش کو دور کر کے واقعات کو دِلچسپ انداز میں بامِ ترقی تک پہنچانا نقطۂ عروج کہلاتا ہے۔ آخر میں سامعین دروازے کے کھلنے اور انجام کی دید کے انتظار میں بیتاب وآرزومند بنے حیرت سے بغور تکتے رہیں۔

(۸) انجام

نقطۂ عروج کے بعد ڈرامے کی آخری منزل انجام ہے۔ ڈرامہ کی آخری منزل ہی ڈرامہ کا انجام کہلاتا ہے۔ اس میں ڈرامے کی کامیابی کے لئے ڈراما نگار کا ہر جزو اور ہر پہلو پر نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے درمیانی روابط واجزاء کی کامیابی کو انجام کی کامرانی کا رازدار تسلیم کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ شروع سے آغاز تک تمام فنی لوازم کی ہم آہنگی اور تسلسل، کشمکش اور تصادم کا کامیاب عروج ڈرامے کے انجام میں تاثر پیدا کرتا ہے۔

5.4 خلاصہ

ڈراما یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ ہندوستان میں ڈرامہ کے متعلق ایک نظریئے سے یوں ملتا ہے یعنی اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں دیوتا اپنی ہموار، سپاٹ، بے تغیر اور بے لطف زندگی سے اکتا کر برہما کے پاس گئے اور اسے کسی دلچسپ مشغلے کے طالب ہوئے۔ برہما نے چاروں ویدوں کا عطر نکال کر ان کے مجموعے سے رقص بنایا اور اس نئے روپ کو ''ناٹیہ شاستر'' کا نام دے دیا۔ اور یہی نسخہ دنیا والوں کے لئے مشعل راہ بنا۔ اسی کی بنیاد پر شکنتلا جیسے دو ناٹک لکھے گئے ان ناٹکوں میں رقص وسرود کے علاوہ اظہار جذبات اور حرکات وسکنات کو جگہ دی گئی۔

آغا حشر کاشمیری کو بابائے ڈراما ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انھیں فاسی، ہندی، عربی اور دیگر زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مرہٹوں اور پارسی اسٹیج نے بھی اردو ڈراموں کو فروغ دیا۔ اس کے بعد ریڈیائی ڈراموں کا دور شروع ہوا۔ جدید دور میں ڈرامے کی

صنف نے کافی ترقی کی۔ بالخصوص انگریزی ادب میں شیکسپیئر کے ڈراموں نے کافی دھوم مچا دی۔ ان کے ڈراموں میں رومیو جولیٹ۔ بزم فانی، بیملٹ۔خون ناحق، مرچنٹ آف ولینس۔دلفروش، اوتھیلو۔شہید وفا' کے ڈرامے کافی مشہور ہیں۔ان ڈراموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جاچکا ہے۔ڈرامے کے اجزاء ترکیبی میں قصہ، کردار، پلاٹ، اور دیگر چیزیں بھی شامل ہیں جن کے بغیر ڈرامہ نگاری ادھوری ہوتی ہے۔ڈرامے کا اصل مزاح اسٹیج پر ہی آتا ہے اس لئے اسٹیج اور ڈرامے کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

5.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات مختصر انداز میں تحریر کیجیے۔

(۱) ڈرامے کی اجزائے ترکیبی مفصل بیان کیجیے؟

(۲) ڈرامے کا فن تحریر کیجیے؟

(۳) ڈرامہ نگاری کی اہمیت بیان کیجیے؟

(۴) ڈرامے نگاری میں کن امور کا ہونا ضروری ہوتا ہے؟

(۵) ڈرامہ کا آغاز کس طرح ہوا؟ واضح کیجیے؟

5.6 فہرہنگ

الفاظ		معنی
فقرے	-	کلام، جملہ، ریڑھ کی ہڈی، عبارت کے ٹکڑے
اسلوب	-	طریقہ، طرز
طربیہ	-	خوشی، شادمانی
منطقی	-	وہ علم جو عقل دلائل سے حق اور ناحق میں تمیز کرتا ہو۔
لوازم	-	لازم کی جمع، ضروری چیزیں
ارسطو	-	افلاطون کا شاگرد، یونان کا مشہور مفکر و فلسفی

5.7 :- شفارش کردہ کتابیں

۱۔ اردو ڈرامے کا ارتقا — عشرت رحمانی

۲۔ آغا حشر اور انکے ڈرامے — وقار عظیم

۳۔ اردو ڈرامہ نگاری تاریخ — ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی

۴۔ آغا حشر کا تمیری کے ڈراموں — ڈاکٹر محمد شفیع

۵۔ تزئین ادب کا ڈرامہ نمبر۔ — ڈاکٹر ساجد علی قادری

اکائی ٦ : اردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد (منتخب اصناف سخن)

اکائی کے اجزاء

6.1 مقاصد
6.2 تمہید
6.3 موضوعات
6.3.1 اردو نظم کا پس منظر
6.3.2 اردو نظم کی تعریف
6.3.3 اردو غزل کی تعریف
6.3.4 غزل کا فن
6.4 خلاصہ
6.5 نمونے کے امتحانی سوالات
6.6 فہرہنگ
6.7 شفارش کردہ کتابیں

6.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔
☆ اردو نظم کے معنی بتاء سکیں گے۔
☆ اردو نظم کا پس منظر واضح کرسکیں گے۔
☆ اردو غزل کے تعریف بیان کرسکیں گے۔
☆ اردو غزل کا مقام متعین کرسکیں گے۔

6.2 تمہید

''نظم'' اردو کی ایک شعری صنف ہے۔ دیگر اصناف شعری کے مقابلے لفظ ''نظم'' کا استعمال بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ جو مختلف ہیئتوں میں لکھی ہے اور دنیا بھر کے موضوعات اس کے وسعت میں شامل ہیں۔

نظمیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ یہاں نظم نگاری اور اردو غزل کو شامل نصاب کر کہ اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ اسی کے علاوہ ان کی اہمیت افادیت، اور اقسام پر بھی غور وخواص کیا جائے گا۔ تا کہ طلباء کو سمجھنے میں آسانی ہوسکیں۔

6.3 موضوعات

6.3.1 اردو نظم کا پس منظر

اردو میں شاعری کی ابتدا قصیدوں سے ہوئی۔اردو ادب عربی و فارسی کے تحت وجود میں آتا رہا اور پروان چڑھتا گیا۔اردو شاعری میں عربی و فارسی زبان وادب کے زیر اثر قصید، رباعی، مرثیہ، مثنوی اور غزل جیسی شعری اصناف وجود میں آئیں۔اردو کے شعرا نے بڑے پیمانے پر عرصۂ دراز تک ان اصناف سخن میں طبع آزمائیاں کیں۔بعض شعرا نے ان روایات سے انحراف کرتے ہوئے اپنی لیے نئی راہوں کا انتخاب بھی کیا جس کے نتیجے میں نظم نگاری جیسی صنف شعری وجود میں آئی لیکن یہ مروجہ اور معروف اصناف سخن کے مقابلے عام نہ ہوسکیں اور ان ہ لوگوں کے زمانے تک محدود رہیں جنھوں نے اس میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔اس کے علاوہ اردو نظم کو دیگر کئی ناموں سے جانا اور پہچانا گیا۔جیسے رباعی، نظم، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ۔اگر اسے صنفی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام اصناف سخن نظم کے ہی بدطن سے پیدا ہوئی ہیں۔

6.3.2 نظم کی تعریف

نظم کے لغوی معنی ''موتی پرونا''، آراستہ کرنا وغیرہ ہیں۔نظم ایسی صنف سخن ہے جو کسی بھی موضوع کو تسلسل سے بیان کرتی ہے جس میں موضوع یا عنوان کی تفصیل ہوتی ہے۔یہ کسی خاص موضوع پر لکھی جاتی ہے۔اس لحاظ سے اس کا میدان غزل سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔غزل کا ایک شعر ایک ہی جذبے کو بیان کرتا ہے مگر نظم میں موضوع کی پوری۔وضاحت ہوتی ہے۔اس میں زندگی کا ہر واقعہ، ہر واردات کا رنگ دیکھائی دیتا ہے۔ماہرین ادب نے نظم کی جو اصطلاحی تعریفات پیش کی ہیں ان کے مطابق اصطلاح ادب میں نظم کی اصطلاح شاعری کی خاص صنف کے لیے استعمال ہوتی ہے۔''نظم'' سے مراد وہ شعری تخلیق ہے جس میں کسی متعین موضوع پر مسلسل اور مربوط طور پر اظہار خیال کیا گیا ہو اور اس میں زندگی کے خارجی ماحول و داخلی کیفیات و احسات کی عکاسی اس طرح کی گئی ہو کہ شاعر کے ذاتی تجربات، انفرادی جذبات احساسات اور مخصوص نظریات بھی واضح کرسکیں گے۔

6.3.3 اردو غزل کی تعریف

غزل عورتوں کی باتیں کرنے یا عورتوں سے باتیں کرنے کا دوسرا نام ہے لیکن ''المعجم''ہی کے حوالے سے عابد علی عابدؔ نے شمس قیس رازی کے غزل کے متعلق جن خیالات کا ترجمہ بیان کیا ہے جس کے مطابق رازیؔ غزل کی ایک اور تعریف ''غزل الکلب'' کے حوالے سے کرتا ہے۔غزل الکلب یعنی ایسی چیخ جو شدید درد اور خوف کے مارے ہرن کی حلق سے نکلتی ہے جب وہ کسی درندے کا شکار ہوجاتا ہے۔رازی کی حکایت کے مطابق جنگل میں جب ہرن کسی شکاری کتے کی گرفت میں آجاتا ہے تو اس وقت وہ اپنے آپ بالکل بے بس و بے دست و پا محسوس کرتا ہے۔اور اسے یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اب اس کی جان کا بچنا محال ہے ایسے وقت میں اپنی جان کے خوف سے اس کے حلق سے جو بے ساختہ اور دردناک چیخ نکلتی ہے ایسے غزل الکلب کہا جاتا ہے۔جو بے حد دردناک اور موثر ہوتی ہے۔اسے صدائے ضعیف بھی کہا جاتا ہے۔اس دردناک چیخ سے کتے پر بھی رقت طاری ہوجاتی ہے اور وہ اپنے شکار کو آزادی کردیتا

ہے۔اردو میں غزل کی تنقید کے بنیاد گزار کا شف الحقائق کے مصنف مولوی امداد امام اثر ہیں۔ان کے مطابق فارسی اور اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں وہ خوبی موجود نہیں جو غزل کی شاعری کے حقوق ادا کر سکے۔اگر چہ عربی زبان میں یہ صفت موجود ہے لیکن عربی میں یہ صنف جڑ نہیں پکڑ سکی۔امداد امام اثر کے مطابق۔

''دو غزل کے لغوی معنی مضامین جو اعلا درجے کے واردات قلبیہ اور ارفع درجہ کے امور ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں۔حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں۔''

6.3.4 غزل کا فن

غزل اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہے۔یہ ہماری شعری اصناف کی سرتاج ہے۔ایک صنف سخن سے بڑھ کر آج غزل ہماری تہذیب کا آئینہ بن گئی ہے۔فراق گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون میں کہا تھا کہ''اگر تمام فنون لطیفہ احساس حیات وکائنات کا عطر ہیں تو غزل اس عطر کا مطر ہے۔''

غزل میں عشقیہ مضامین کے علاوہ زندگی سے متعلق دیگر موضوعات بیان کئے جاتے رہے ہیں۔انسانی زندگی سے متعلق ہر طرح کے موضوعات کو انگیز کرنے کی صلاحیت غزل میں روز اول ہی سے موجود رہی ہے۔اور اس کا ارتقائی سفر اس بات کا گواہ ہے۔

6.4 خلاصہ

نظم اردو شاعری کی ایک مقبول صنف ہے۔اس صنف میں خیالات وافکارات کی کوئی پابندی نہیں ہوتی ہے۔یعنی جب شاعر کسی خاص موضوع پر اپنے افکار وتاثرات کو مسلسل اشعار کی شکل کی صورت میں ربط وتسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ خارجی ماحول و داخلی کیفیات واحسات کی عکاسی،شاعر کے ذاتی تجربات، انفرادی جذبات واحساسات اور مخصوص نظریات بھی شامل ہو جاتے ہیں تو اسے نظم کہتے ہیں۔

غزل اردو کی شعری اصناف میں سب سے زیادہ مقبول صنف سخن ہے۔غزل کی ابتدائی تعریف کے مطابق یہ''عورتوں سے گفتگو کرنے یا عورتوں کی''گفتگو کرنے'' کا فن ہے۔اسی تعریف کو بیسویں صدی میں فراق گورکھپوری نے محبوب سے''گفتگو یا محبوب کی گفتگو'' کا فن قرار دے کر ایک نئی وسعت بخشی۔غزل کی ابتدائی تعریف کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ محض عشقیہ مضامین کے بیان کی صنف نظر آتی ہے۔

6.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سے بیس سطروں میں تحریر کیجیے۔

(۱) اردو نظم سے کیا مراد ہے؟ واضح کیجیے۔

(۲) اردو غزل سے کیا مراد ہے؟ واضح کیجیے۔

(۳) اردو غزل کی تعریف بیان کیجیے؟

(۴) اردو نظم کا پس منظر تحریر کیجیے؟

6.6 فہرہنگ

جزولاینفک ۔ وہ حصہ جو الگ نہ ہو سکے

نیرنگئی خیال ۔ خیال کی جادوگری

لغوی معنی ۔ وہ معنی جو لغت میں بیان کئے گئے ہوں

گل ۔ گلہ کا مخفف

مَن ہرن ۔ دل چرانے والا

تے ۔ بمعنی سے

سمدور ۔ سمندر

مردّف : غزل جس میں قافیے کے بعد ردیف کا بھی اہتمام ہو۔

سامع : سننے والا

قاری : پڑھنے والا

حباب : پانی کا بلبلہ

6.7 شفارش کردہ کتابیں

(۱) اردو غزل ۔ یوسف حسین خان

(۲) غزل اور متغزلین ۔ ابواللیث صدیقی

(۳) تاریخ ادب اردو ۔ جمیل جالبی

(۴) مقدمات شعروزبان ۔ مسعود حسین خان

(۵) تاریخ ادب اردو ۔ سیدہ جعفر۔ گیان چند جین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۷ : اردو غزل گوئی

اکائی کے اجزاء

7.1 مقاصد
7.2 تمہید
7.3 موضوعات
7.3.1 غزل کے معنی ومفہوم
7.3.2 اردو غزل کا آغاز و مختلف ادوار میں
7.3.3 غزل کی ہیت / غزل کے اجزائے ترکیبی
7.3.4 جدید اور معابعد جدید غزل
7.4 خلاصہ
7.5 نمونے کے امتحانی سوالات
7.6 فہرہنگ
7.7 شفارش کردہ کتابیں

7.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔۔۔۔
☆ اردو غزل کے معنی ومفہوم واضح کرسکیں گے۔
☆ اردو غزل کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ اردو غزل کی ہیت یا اجزائے ترکیبی سے واقف ہوسکیں گے۔

7.2 تمہید

''غزل'' اردو کی ایک شعری صنف ہے۔ لفظ ''غزل'' عموماً نثر کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس سے مجموعی طور پر جملہ اصناف شعری مراد ہوتے ہیں لیکن دیگر اصناف شعری کے مقابلے لفظ ''غزل'' کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس صنف سے ایک خاص مراد لی جاتی ہے جس کی اپنی ایک متعینہ تعریف ہے۔ یہ ہمہ گیر اور وسیع ترین صنف شعری ہے جو مختلف ہیئتوں میں لکھی ہے اور دنیا بھر کے موضوعات اس کے وسعت میں شامل ہیں۔

اس باب میں غزل گوئی کے متعلق اہم معلومات جمع کی گئی ہیں۔ جس میں غزل گوئی کا آغاز، معنی ومفہوم اور مختلف ادوار میں اسے کس نام سے جانا اور پہچانا گیا اسی کے ساتھ آج دور حاضر میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس سے متعلق ہم جائزہ لے سکیں گے۔

7.3 موضوعات

7.3.1 غزل۔معنی ومفہوم

غزل عربی لفظ ہے۔جس کے معنی عورتوں سے گفتگو کرنا ہوتے ہیں۔اسی مناسبت سے غزل عورتوں سے باتیں کرنے یا عورتوں کی باتیں کرنے سے عبارت ہے۔اسی حوالے سے یہ صنف عشقیہ مضامین کے بیان کے لئے ایک مثالی نصف مانی جاتی ہے۔خود لفظ غزل میں اس قدر غنائیت اور حسن ہے کہ اس کے ساتھ اک حسین وجمیل پیکر ذہن میں ابھر آتا ہے۔

غزل کے شاعر کو محبوب کی چشم غزالی، اور اس کا پیکر غزل کا پیکر لگتا ہے۔غزل حسن وعشق کی شاعری کا دوسرا نام ہے۔ غزل کی ابتداء سے یہی معنی مقبول عام تھے یہ الگ موضوعات بات کہ وقت کے ساتھ ساتھ غزل کے موضوعات جس سے اس کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہوا اور آج وہ زندگی کے ہر موضوع سے مناسبت و یگانگت رکھتی ہے۔لیکن ہم یہاں غزل کے لغوی معنی سے بحث کررہے ہیں۔

اردو غزل کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حسن وعشق اور معاملات دل کے علاوہ دیگر مضامین بھی شروع ہی سے غزل کی شاعری کا حصہ رہے ہیں۔قدیم غزلیہ شاعری میں بھی حیات کے مسائل اور فلسفۂ حیات پر مشتمل مضامین آسانی سے تلاش کئے جاسکتے ہیں۔اس لئے عورتوں سے باتیں کرنا غزل کی تاریخ کا حصہ تو ہوسکتا ہے لیکن اسے غزل کی مکمل تعریف نہیں کہا جاسکتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ عام طور پر غزل میں محبت اور محبت کے متعلق مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ کوئی انسانی دل عشق ومحبت کے جذبے سے خالی نہیں ہوتا۔عشق ومحبت اعلیٰ انسانی اقدار میں سے ایک اور آفاقی جذبے ہیں اسی لئے ہر انسان اس سے متاثر ہوتا ہے اور غزل کے اشعار کو اپنے جذبات کا ترجمان تصور کرتا ہے۔یہی دراصل غزل کی مقبولیت کا اصل راز ہے۔غزل کے اشعار کی یہ خوبی ہے کہ وہ قاری یا سامع کو فوری یاد ہوجاتے ہیں اور گفتگو کے دوران برجستہ ادا ہوجاتے ہیں ۔ان اشعار کو لوگ اپنے ماضی الضمیر کی ادائیگی میں شدت کی خاطر یا اپنے جذبات کے ہر تاثر اظہار کے لئے برملا استعمال کرتے ہیں۔مقرر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ان کا برملا استعمال کرتے ہیں۔اردو کی دیگر شعری اصناف مثنوی، قصیدہ، مرثیہ وقت کے ساتھ اپنی آب وتاب کھوکر گمنانی کے غاروں میں چل گئیں۔خود نظم جیسی صنف بھی حالات کے تھپیڑوں کا شکار رہی ہے۔لیکن غزل کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ایک ایسی صنف جو اپنی ابتداء میں صرف اور صرف عشقیہ مضامین کے لئے مخصوص تھی اور جس کی بناء پر اسے بے محابا تنقید کا شکار بھی ہونا پڑا کبھی اپنے موضوعات کی وجہ سے تو کبھی اپنی ہیئت کی بناء پر غزل کو نشان ملامت بنایا گیا۔لیکن غزل نے زندگی کے مختلف موضوعات اور مختلف النوع کیفیات کی ادائیگی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔آج اردو شعری اصناف میں کوئی صنف ایسی نہیں ہے جو زندگی کی مختلف واردات اور کیفیات کو کم سے کم الفاظ میں اس شدت تاثر کے ساتھ پیش کرسکے جس طرح وہ غزل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

7.3.2 اردو غزل گوئی کے آغاز کے مختلف ادوار

(۱) اردو غزل گوئی کا آغاز اور پہلا غزل گو شاعر

اردو میں غزل گوئی کا آغاز امیر خسرو کے عہد میں ہوتا ہے اور پہلا غزل گو شاعر بھی امیر خسرو ہی ہیں۔ (۱۲۲۵۔۱۲۵۳ء) میں خسرو کی غزل کا نمونہ ملتا ہے جس کا ایک مصرعہ فارسی اور ایک مصرعہ اردو (ہندوی) میں ہے۔

(۲) دکن میں غزل گوئی کا آغاز

دکن میں اردو زبان صوفیائے کرام کی تبلیغ کے ذریعہ پہنچی اور بہمنی دور میں فیروز، مشتاق اور لطفی وغیرہ نے غزل گوئی کی، یہ الگ بات ہے کہ ان شعرا نے اپنی علاقائی زبان کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

اس کے بعد غزل کا سلسلہ گولکنڈہ حکومت میں شروع ہوتا ہے جس میں محمد قلی قطب شاہ و مشتاق ایسے غزل گو شاعر ہوئے ہیں جنہیں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ محمد قلی نہایت ہی سنجیدگی، سادگی سے جذبات و احساسات و مشاہدات کو غزل میں بیان کرتے تھے ان کی شاعری میں خالص ہندوستانی رنگ نظر آتا ہے

(۳) شمالی ہند میں غزل گوئی کی نشاۃ الثانیہ

شمالی ہند میں غزل گوئی کا آغاز امیر خسرو ہی کے عہد میں شروع ہو گیا تھا، مگر وہ سلسلہ برقرار نہیں رہ سکا تھا اور دکن میں ترقیات سے ہمکنار ہو کر ایک مرتبہ پھر ولؔی کے اثرات سے غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ خان آرزوؔ، آبروؔ، حاتمؔ اور مرزا مظہر جان جاناںؔ وغیرہ شعرا نے غزل گوئی شروعات کی۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ ولؔی کی آمد سے قبل بھی ریختہ میں شاعری ہو رہی تھی اور غزل بھی کہے جا رہے تھے مگر صرف زبان کا مزہ بدلنے کے لئے تھا، اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی، مگر ولؔی کی آمد کے بعد اہمیت کے ساتھ اس زبان میں شاعری ہونے لگی۔

(۴) میرؔ و سوداؔ کا دور

یہ عہد اردو شاعری کا ایک زریں دور مانا جاتا ہے۔ اس عہد تک پہنچتے پہنچتے شمالی ہند میں اردو شاعری تقریباً نصف صدی کا سفر طئے کر چکی تھی۔ اس عہد کے اہم غزل گو شاعر میر تقی میرؔ مرزا محمد رفیع سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ ہیں۔ یہ دور محمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی تک کے عہد حکومت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ تینوں شاعر مختلف مزاج رکھتے ہیں اور تینوں کی زندگیاں بھی الگ الگ انداز سے گزریں۔ میرؔ نے اپنی داخلی کیفیات کو غزل کا جامہ پہنایا تو سوداؔ نے اپنے کارناموں کو۔ ان کی شاعری میں فارسی کا بہت گہرا اثر ہے تو وہیں دردؔ نے اپنے تصوف کی آگ سے غزل کو کندن بنا دیا۔

(۵) غالبؔ اور ذوقؔ کے عہد میں غزل گوئی

بہادر شاہ ظفرؔ کے عہد میں ایک مرتبہ دہلی میں شعرا کی بزم آراستہ ہوئی۔ اس وقت پوری طرح سے انگریز حکومت پر قابض ہو چکے تھے، بہادر شاہ ظفرؔ کی حکومت برائے نام قلع تک محدود تھی۔ اس زمانہ میں جن شعرا نے غزل کے حسن کو نکھارنے اور اس میں

چار چاند لگانے اور ادبی افق پر اپنے نقوش چھوڑنے میں کامیابی حاصل کی جن میں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ شعراء اہم ہیں۔ شاہ نصیر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں سوداؔ کی جھلک نظر آتی ہے ان کی غزلوں میں داخلی کیفیات کی جھلک کے ساتھ ساتھ خارجیت کے مناظر بھی خوش گوار آتے ہیں۔

(۶) حالیؔ کے بعد غزل گوئی کی روایت

غالب اور ذوق کے بعد غزل انحطاط کی طرف مائل ہونے لگی تھی۔ شاعری کو صرف لفظی بازی گری کا ذریعہ سمجھا جانے لگا تھا۔ مشکل زمینوں میں شاعری کرنے کو ہی کمال سمجھا جاتا تھا۔ ایسے میں حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر غزل کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کی اور اس کا اثر شعرا نے قبول بھی کیا۔ ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، یگانہ، چکبستؔ اور آرزوؔ وغیرہ نے غزل میں حیات و کائنات کے مسائل اور صداقت پر مبنی احساسات و تجربات کو شامل کر کے اس کے وقار کو بلند کیا اور اسے ایک نئی زندگی بخشی۔

7.3.3 غزل کی ہیت/ غزل کے اجزائے ترکیبی

غزل بلاشبہ ایک ہیتی صنف سخن ہے۔ غزل کی ہیئت کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں۔

۱۔ مطلع ۲۔ ردلف ۳۔ قافیہ ۴۔ مقطع ۵۔ بحر

(۱) مطلع

مطلع غزل کے پہلے شعر کو کہا جاتا ہے مطلع کے معنی ہیں طلوع ہونے کی جگہ۔ گویا مطلع وہ شعر ہے جہاں سے غزل کا آغاز ہوتا ہے۔ مطلع کی اصل شناخت اس کے دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ہے۔ مطلع کے بعد آنے والے اشعار کا پہلا مصرعے قافیے کا پابند ہیں ہو یا دوسرے مصرعے میں قافیہ کا استعمال لازمی طور پر کیا جاتا ہے۔ مطلع کا شعر کی اہمیت اسی لئے بھی ہے کہ اس کے ذریعے غزل کا قافیہ اور ردیف کا تعین ہوتا ہے۔

(۲) ردیف

ردیف ایک لفظ پر مشتمل بھی ہوسکتی ہے اور کئی الفاظ پر بھی۔ ردیف دراصل ان مشترک الفاظ کا مجموعہ ہے جو ہر شعر میں ہر شعر کے موضوع کے جدا ہونے کے باوجود انھیں ایک لڑی میں پرونا ہوتا ہے۔ انتشار خیالی غزل کا بنیادی وصف ہے لیکن ردیف کے الفاظ موضوع اور ہیئت کی سطح پر غزل میں اس زیریں لہر کے پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں جو شعر کے اپنے آپ میں مکمل ہونے کے باوجود کسی اکائی کا جز ہونے کا تصور پیدا کرتے ہیں۔

(۳) قافیہ

مطلع کی اصل شناخت اس کے دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ردیف ہوتے ہیں۔ غزل کے ردیف و قافیہ کے تعین کی ذیل میں مطلع کا کردار ہی سب سے اہم ہوتا ہے۔ ایک طرح سے مطلع ردیف و قافیہ کے تعین کے

علاوہ غزل کے مجموعی مزاج کا تعین بھی کر دیتا ہے۔

(۵) مقطع

مقطع کے لغوی معنی ''قطع کرنا'' کے ہوتے ہیں۔ یوں تو مقطع بھی غزل کے دیگر اشعار کی طرح ایک عام شعر ہوتا ہے لیکن اس میں تخلص کا استعمال عام شعر کو بھی مقطع کا شعر بنا دیتا ہے۔ گویا شاعر کی جانب سے تخلص کا استعمال ہی مقطع کی اصل شناخت ہے۔ عموماً شاعر اپنے اصلی نام کے علاوہ ایک قلمی نام اختیار کرتا ہے۔ جسے تخلص کہا جاتا ہے۔

(۶) بحر

شاعری کے لئے بحر ضروری ہے اسی طرح غزل کے لئے بھی بحر کا ہونا لازمی۔ بحر وہ ڈھانچہ ہے جس پر شعر کی عمارت تعمیر ہو رہے جس پر شعر کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ بحر مختلف چھوٹے اور بڑے مصوتوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ یہ مصوتے ایک خاص ترتیب میں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اشعار میں نغمگی یا غنائیت پیدا ہوتی ہے۔ بحر چھوٹے اور بڑے مصوتوں کی مخصوص ترتیب سے تشکیل پاتی ہے۔ چند چھوٹے اور لمبے مصوتوں کو ترتیب دے کر ایک اکائی بنائی جاتی ہے۔ جسے بحر کہا جاتا ہے۔

7.3.4 جدید اور مابعد جدید غزل

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک دم توڑنے لگی تھی۔ لوگوں کے جذبات و احساسات تبدیل ہو رہے تھے اسی عہد میں ۱۹۵۵ء کے بعد جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی جو جدیدیت کے فلسفہ سے متاثر ہو کر شروع ہوئی۔ اس عہد میں اس تحریک کے شعرا نے غزل کی زبان اور موضوعات دونوں چیزوں میں تبدیلیاں کیں اور زبان و فن سے نئے نئے تجربات کر کے غزل کے دامن کو وسیع کیا۔ یہ تحریک ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر شروع ہوئی تھی ان شعرا میں ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی اور ندا فاضلی وغیرہ ہیں۔ لیکن ۱۹۸۰ء تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک بھی کمزور ہونے لگی۔ لوگوں کے مسائل بدلنے لگے اور ایک نئے رجحان کا آغاز ہوا جسے مابعد جدیدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس رجحان سے وابستہ شعرا نہ جدت پسندی کے قائل تھے اور نہ ترقی پسندی کے۔ بلکہ اپنی ایک الگ راہ نکالنا چاہتے تھے اور مثبت عناصر پر مبنی اس رجحان کو فروغ بھی ملا۔

7.4 خلاصہ

اردو غزل کا آغاز شمالی ہند میں امیر خسرو کے عہد میں ہوا۔ جسے اردو غزل کا اولین نمونہ کہا جاتا ہے جس کا ایک مصرع فارسی اور ایک ہندوی کا ہے۔ اس کے بعد اردو غزل نے دکن میں اپنا مقام بنایا اور بہمنی سلطنت میں مشتاق اور لطفی وغیرہ نے غزل گوئی کی۔ اس کے بعد عادل شاہی میں گولکنڈہ میں قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور وجہی نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد ولی اور سراج وغیرہ کا عہد شروع ہوا اس عہد میں غزل نے خاطر خواہ ترقی کی اور انہیں کے زیر اثر ایک مرتبہ پھر شمالی ہند میں غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ مگر ابتدا میں ایہام گوئی شروع ہوگئی۔ اس کے بعد اصلاح زبان کی تحریک نے اس کا خاتمہ کیا اور میر و سودا کے عہد میں مزید ترقی ہوئی اور دہلی کی تباہی کی وجہ سے دبستان لکھنو میں غزل کی روایت شروع ہوئی پھر غالب اور ذوق کے عہد کے بعد حالی نے غزل کو ایک نئی سمت

دی۔اس کے بعد ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کے ہاتھوں کچھ انداز بدلا کہ جدیدیت کا آغاز ہوا اور کچھ عرصہ بعد مابعد جدیدیت کا بھی سلسلہ شروع ہوا۔آج اسی عہد میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں۔

7.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سے بیس سطروں میں تحریر کیجیے۔

(۱) اردو غزل کی تعریف بیان کیجیے؟

(۲) اردو غزل کا آغاز بیان کیجیے؟

(۳) اردو غزل کا پس منظر بیان کیجیے؟

(۴) اردو غزل کا شمالی ہند میں کس طرح ہوا؟ واضح کیجیے؟

(۵) اردو غزل سے آپ کیا معنی اخذ کرتے ہیں؟ اسے اپنے انداز میں تحریر کیجیے۔

(6) اردو غزل کو آگے بڑھانے میں کن شعراء کے نام قابل ذکر ہیں؟

(7) جدید دور میں غزل کے موضوعات کون سے ہیں؟

7.6 فہرہنگ

الفاظ		معنی
گور	:	قبر
کج نظری	:	ٹیڑھی نگاہ
نیرنگ	:	انقلاب
خراش	:	چبھن
بازیچہ	:	کھیل
واکرنا	:	کھولنا
غماز	:	آنکھ سے اشارہ کرنے والا
سوزش	:	جلن

7.7 شفارش کردہ کتابیں

(۱)	غزل اور مطالعۂ غزل	عبادت بریلوی
(۲)	اردو غزل	یوسف حسین خاں
(۳)	غزل اور متغزلین	ابواللیث صدیقی
(۴)	اردو غزل	ڈاکٹر کامل قریشی
(۵)	جدید شاعری	عبادت بریلوی
(۶)	آئینہ شعری ادب	ڈاکٹر ساجد علی قادری

اکائی ۸ : اردو نظم نگاری

اکائی کے اجزاء

8.1 مقاصد
8.2 تمہید
8.3 موضوعات
8.3.1 جدید اردو نظم کا پس منظر
8.3.2 اردو نظم نگاری کی تعریف
8.3.3 انجمن پنجاب اور جدید اردو نظم نگاری کا آغاز
8.4 خلاصہ
8.5 نمونے کے امتحانی سوالات
8.6 فہرہنگ
8.7 شفارش کردہ کتابیں

8.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔۔۔
☆ جدید اردو نظم نگاری کے پس منظر سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ اردو نظم نگاری کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس کا جائزہ لے سکیں گے۔
☆ اردو نظم نگاری کی تعریف بیان کرسکیں گے۔

8.2 تمہید

اس باب میں ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب خصوصاً اردو شاعری میں مغربی ادبیات کے تحت پیدا ہونے والے جدید رجحانات کے زیر اثر اردو ادب میں شعوری تبدیلی پیدا کرنے کی غرض سے وجود میں آنے والی پہلی ادبی تحریک ''انجمن پنجاب'' کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں انجمن پنجاب سے قبل اردو شاعری میں نظم کے نقوش پیش کرتے ہوئے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگلی اکائیوں میں انجمن پنجاب کے قیام کے اغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے اردو میں جدید نظم کے فروغ میں انجمن پنجاب کی خدمات کو اُجاگر کیا گیا اور انجمن کے مشاعرے اور ان مشاعروں کے اردو شاعری پر اثرات کو پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں انجمن پنجاب سے وابستہ شعرا کی خدمات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے روایتی شاعری کے خلاف آواز اُٹھائی اور اردو میں جدید طرز کی موضوعاتی شاعری کی بنیاد رکھی۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام مشاعرے رکھے جن میں شعرا کو طرحی مصرع کے بجائے موضوع تجویز کیے جاتے جن پر شعرا کو نظمیں لکھنے کی دعوت دی جاتی۔ اس تحریک نے اردو میں نہ صرف نظم نگاری کے لیے میدان ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

8.3 موضوعات

8.3.1 جدید اردو کا نظم کا پس منظر

۱۸۵۷ء کا زمانہ اردو شعر وادب میں ''جدید دور'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں علی گڑھ تحریک نے اردو شعر وادب کو نئے رنگ وآہنگ، نئے سانچے اور نئی سمتوں سے روشناس کرانے کا کانامہ انجام دیا۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اس دور میں اردو شاعری انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے متاثر ہوئی۔ جدید علوم وفنون اور انگریزی شعر وادب سے اثر پذیری کے نتیجے میں اردو میں نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ علی گڑھ تحریک کے علمبرداروں نے اردو شاعری کے دائرے کو وسیع کرنے اور اسے نئی جہتوں سے آشنا کرنے کے سلسلے میں ایک ناقابل فراموش رول ادا کیا ہے۔ سرسید احمد خاں شاعری کے افادی پہلو سے ہم سب بخوبی واقف تھے اس لیے وہ شاعری کو قوم کی اصلاح وتعمیر کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے اس مقصد کے لیے انھوں نے نظم نگاری کا انتخاب کرنے کی سفارش کرتے ہوئے شعرا کو نظم گوئی پر آمادہ کیا۔

8.3.2 نظم کی تعریف

نظم ایک نہایت بسیط ووسیع اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ''موتی پرونا''، آراستہ کرنا وغیرہ ہیں۔ نظم ایسی صنف سخن ہے جو کسی بھی موضوع کو تسلسل سے بیان کرتی ہے جس میں موضوع یا عنوان کی تفصیل ہوتی ہے۔ یہ کسی خاص موضوع پر لکھی جاتی ہے اس لحاظ سے اس کا میدان غزل سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ غزل کا ایک شعر ایک ہی جذبے کو بیان کرتا ہے مگر نظم میں موضوع کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کا ہر واقعہ، ہر واردات، ہر مظہر، ہر رنگ ملتا ہے۔ یہ ذہنوں کو آسودگی دل کو فرحت اور اطمنان بخش کر ایک انبساط انگیز فضا عطا کرتی ہے۔

ماہرین ادب نے نظم کی جو اصطلاحی تعریفات پیش کی ہیں ان کے مطابق اصطلاح ادب میں نظم کی اصطلاح شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ''نظم'' سے مراد وہ شعری تخلیق ہے جس میں کسی متعین موضوع پر مسلسل اور مربوط طور پر اظہار خیال کیا گیا ہو اور اس میں زندگی کے خارجی ماحول وداخلی کیفیات واحسات کی عکاسی اس طرح کی گئی ہو کہ شاعر کے ذاتی تجربات، انفرادی جذبات واحساسات اور مخصوص نظریات بھی وضع ہو جائیں۔

8.3.3 : انجمن پنجاب اور جدید نظم نگاری کا آغاز

محمد حسین آزاد نے ''کرنل ہالرائیڈ'' کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی اور یہیں سے اردو میں جدید نظم نگاری کی بنیاد بھی پڑی۔ انجمن پنجاب کا اصل نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' تھا لیکن یہ ''انجمن پنجاب'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ انجمن

پنجاب کو ۲۱ر جنوری ۱۸۶۵ء میں قائم کیا گیا۔ ''ڈاکٹر جی۔ بی ڈبلیو لائٹز'' جو ''گورمنٹ کالج، لاہور'' کے پرنسپل تھے انھیں ادارے کا صدر منتخب کیا گیا اور محمد حسین آزاد کو انجمن کا سیکریٹری اور لیکچرر منتخب کیا گیا ساتھ ہی وہ انجمن کے ترجمان ''رسالہ انجمن اشاعت مطالب'' کے ایڈیٹر بھی منتخب ہوئے۔ انجمن کے جلسوں میں محمد حسین آزاد مختلف موضوعات پر مضامین پڑھتے اور لیکچر دیا کرتے تھے۔

۱۹ر اپریل ۱۸۷۴ء کو منعقدہ ایک جلسے میں انھوں نے شاعری پر ایک جامع اور تفصیلی لیکچر دیا جس میں انھوں نے اردو کی روایتی شاعری میں موجود کمزوریوں کو واضح کرتے ہوئے شعرا سے نظم نگاری کی سفارش کی اور ایک نظم ''شبِ قدر'' بطور نمونہ پیش کی۔ کرنل ہالرائیڈ جو اس وقت محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، کو نہ صرف آزاد کی نظم پسند آئی بلکہ انھوں نے آزاد کے لیکچر کو بہت پسند کیا اور ان کے خیال کی بھرپور تائید کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہر مہینے ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے جس میں کسی خاص مضمون یا عنوان کے تحت شعرا نظمیں لکھ کر لائیں اور اپنی تخلیق کو پیش کریں۔ اسی جلسے میں پہلے مشاعرے کے لیے ''برسات'' کا عنوان دیا گیا۔ اس طرح انجمن پنجاب کے توسط سے اردو میں جدید نظم نگاری راہ ہموار کی گئی۔ محمد حسین آزاد نئی نظم کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے خود بھی موضوعاتی نظمیں کہی ہیں جن کا اردو ادب میں خاص مقام ہے۔ ''شب قدر'' کے علاوہ ''صبح امید''، ''خواب امن''، ''وداع انصاف''، ''ابر کرم''، ''گنج قناعت'' اور ''حب وطن'' جیسی تاریخی نظمیں لکھیں۔

8.4 خلاصہ

اٹھارہویں صدی میں محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے اردو میں جدید طرز کی موضوعاتی شاعری کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ لیکن محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام مشاعرے رکھے جن میں شعرا کو طرحی مصرع کے بجائے موضوع تجویز کیے جاتے جن پر شعرا کو نظمیں لکھنے کی دعوت دی جاتی۔ اس تحریک نے اردو میں نہ صرف نظم نگاری کے لیے میدان ہموار کرنے میں اہم کردار ادا نہیں کیا بلکہ اردو نظم کے فروغ اور ارتقا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آگے چل کر محمد حسین آزاد نے شاعری پر ایک جامع اور تفصیلی لیکچر دیا جس میں اردو کی روایتی شاعری میں موجود کمزوریوں کو واضح کرتے ہوئے شعرا سے نظم نگاری کی سفارش کی اور ایک نظم ''شبِ قدر'' بطور نمونہ پیش کی۔ کرنل ہالرائیڈ جو اس وقت محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، کو نہ صرف آزاد کی نظم پسند آئی بلکہ انھوں نے آزاد کے لیکچر کو بہت پسند کیا اور ان کے خیال کی بھرپور تائید کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہر مہینے ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے جس میں کسی خاص مضمون یا عنوان کے تحت شعرا نظمیں لکھ کر لائیں اور اپنی تخلیق کو پیش کریں۔ اسی جلسے میں پہلے مشاعرے کے لیے ''برسات'' کا عنوان دیا گیا۔

8.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سے بیس سطروں میں تحریر کیجیے۔

(۱) اردو نظم سے کیا مراد ہے؟

(۲) اردو نظم نگاری کا پس منظر واضح کیجیے؟

(۳) اردو نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے؟

(۴) انجمن پنجاب کے ذریعہ نظم نگاری کو کس طرح فروغ حاصل ہوا؟

8.6 فہرہنگ

الفاظ	معنی
انجمن	مدرسہ یا تعلیمی ادارہ
خصوصیات	خوبی
گور	قبر
کج نظری	ٹیڑھی نگاہ
نیرنگ	انقلاب
خراش	چبھن
بازیچہ	کھیل
وا کرنا	کھولنا

8.7 شفارش کردہ کتابیں

1 انتخاب محمد قلی قطب شاہ از: تصحیح وترتیب محمد اکبرالدین صدیقی
2۔ دکنی ادب کی تاریخ از: ڈاکٹر محی الدین قادری زور
3۔ تاریخ ادب اردو از: جمیل جالبی، جلد دوم
4۔ آب حیا تاریخ ادب اردو از: پروفیسر نورالحسن نقوی
5۔ اردو ادب کی تاریخ از: عظیم الحق جنیدی
6۔ تاریخ ادب اردو از: رام بابو سکسینہ
7۔ آب حیات از: مولانا محمد حسین آزاد

☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۹ : ادبی تحریکات ورجحانات کا جائزہ (انیسویں صدی)

اکائی کے اجزاء

9.1 مقاصد
9.2 تمہید
9.3 موضوعات
9.3.1 ادبی تحریکات کے معنی ومفہوم
9.3.2 ادبی رجحان کے معنی ومفہوم
9.3.3 ادبی تحریک اورادبی رجحان کے درمیان فرق
9.3.4 تحریک سازی اور رجحان سازی کے عوامل
9.4 خلاصہ
9.5 نمونے کے امتحانی سوالات
9.6 فہرہنگ
9.7 شفارش کردہ کتابیں

9.1 مقاصد

☆ اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد طلباء۔۔۔
☆ ادبی تحریکات اورادبی رجحانات کے معنی ومفہوم بیان کرسکیں نگے۔
☆ ادبی تحریکات اورادبی رجحانات کے درمیان فرق واضح کرسکیں گے۔
☆ تحریک سازی اور رجحان سازی کے عوامل سے واقف ہوسکیں گے۔

9.2 : تمہید

چونکہ اردو تحریکات ایک وسیع موضوع ہے۔طالب علموں کو اس کی تاریخ کو جاننے اوراس کی ادبی وسماجی اہمیت کو سمجھنے کے لیے، ان تمام پہلوؤں پر غور کرنا بھی ضروری ہوجاتا ہے جن حالات سے یہ تحریکیں جنم لیتی ہیں اوران کے اثرات ادب وعلوم پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کے لیے بھی آمادہ کرتا ہے کہ طالب علم کو ان حالات سے بھی بخوبی واقفیت حاصل ہوسکے، جن کے اثر یا پس منظر میں ان تحریکوں نے جنم لیا، اوران کا ارتقا ہوا اور پھر یہ اپنے مقصود کو پہنچ کر ایک نئی سمت کی جانب لے جا کر پھر ایک نئی تحریک کی راہ ہموار کر گئیں۔ ادب میں ہونے والے اسی تغیر کو تحریک کا نام دیا گیا ہے۔اس اکائی میں ادبی تحریکات کے معنی ومفہوم، تعارف، ادبی

وعوامی اہمیت اور تحریکوں کا ابتدائی پس منظر کے علاوہ اس کے ادبی اثرات کے جائزے کا مکمل اور ضروری احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ طلبہ وطالبات کو مجموعی معلومات حاصل ہو سکے۔

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ اگر کوئی نیا ادبی رجحان نئے افق روشن نہ کر سکے اور حالات کو اپنے نصب العین سے متاثر نہ کر سکے تو اس رجحان کو وجود میں لانے والے ادبا وشعرا کی ذات پر بھی شکوک وشبہات کے بادل منڈلانے لگتے ہیں اور ان ادبا وشعرا کا دائرۂ اثر وعمل بھی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک وابستگان کو متاثر نہیں کیا جائے گا تب تک نئے رجحان کا دائرہ وسیع نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہی کہ اس رجحان کے نشانات کو نئے خیالات کا جامع پہنا کر نئی سمت میں گامزن رکھا جائے اور نئے خیالات کے ذریعہ اس میں فروغ دینے کی مثبت سعی کی جائے تو کہیں کوئی رجحان عملی دائرہ اختیار کر پاتا ہے۔ تاریخی شواہدات سے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ قدیم ادب کے کئی ایسے رجحانات ادب کو زیادہ متاثر نہ کر پانے کی وجہ سے مستقبل پر اپنے دیرپا نقوش مرتسم کیے بنا ہی گم ہو گئے یا پوری طرح مٹ گئے۔

9.3 موضوعات

9.3.1 ادبی تحریکات کے معنی ومفہوم

جمود یا ساکن میں حرکت پیدا کرنے کا نام تحریک ہے۔ اس عمل میں تسلسل کا ہونا اس کا طبعی تحرک کبھی ختم نہ ہونے سے اسے ایک مخصوص نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو اس کی شناخت کا باعث بنتا ہے اور اس عمل کو ایک وسیع مفہوم عطا کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے یوں بھی متعارف کرایا جاسکتا ہے کہ تخلیق کائنات کے جمود میں جب حرکت کا عمل پیدا ہوا اور یہ مسلسل جاری رہے۔ تو اسی تحرک کو نئے عمل کے طور پر، ایک نئے احساس کے ساتھ محسوس کیا گیا جسے تحریک کا نام دیا گیا۔ جو جمود کی مخالفت مسلسل کرتا ہے اور اس کی تمام قدیم اور لامتناہی حالت کو منتشر کر کے ایک نئے وجود کی تشکیل کرتا ہے اور اس میں مسلسل فعالیت برقرار رکھتا ہے۔ جمود کی حالت کے خلاف یہ نیا عمل ایک نیا احساس تو پیدا کرتا ہی ہے ساتھ ہی نئے اشارات کی جانب گامزن رہنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ تحریک کبھی مرتی نہیں اور جب ایک تحریک اپنا وجود کھونے لگتی ہے تو حالات کے پیش نظر ایک نیا چولا یا روپ اختیار کر کے نئے نام سے موسوم ہو جاتی ہے اور اس طرح تحریک مسلسل تغیر پذیر رہتی ہے۔

9.3.1 رجحانات کے معنی ومفہوم

شعور کی تازہ رو کو کسی نئے رخ کی جانب مائل کرنے کی فطرت کو رجحان کہتے ہیں۔ ادب میں اس کے کوئی عام فہم معنی موجود نہیں جس سے اس کو جانا پہچانا جائے۔ زمانہ قدیم سے انسانی ذہن میں نئی نئی خواہشات جنم لیتی رہتی ہیں۔ اور ان کی تکمیل کی جستجو، ان میں نئی تحریک پیدا کرتی رہی ہے، جو انسان کے پرسکون داخل کو متحرک کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی مصریوں، رومیوں، بابلیوں نے علوم تو دریافت کر لیے تھے لیکن ان کے دائرہ اثر صرف چند مخصوص لوگوں تک ہی محدود تھا۔ ان کو سمجھنا عوام کے لیے تقریباً

ناممکن تھا، جس کی وجہ سے ان کے درس وتدریس کا کام بھی مخصوص لوگوں کے پاس تھا اور عوام کو ان سے دور رکھا جاتا تھا۔

چھٹی صدی، قبل مسیح یہ حالت بدلی اور شعور نے نئی کروٹ لی اور عام انسان بھی کائنات کی حقیقت جاننے اور سمجھنے کے لیے بیتاب ہوگیا اور ایسے سوالات دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فکر وشعور کی تازہ رو چلنے لگی اور عام لوگ بھی دنیا کو نئے سوالات کو نئے انداز میں دیکھنے لگے۔ فلسفہ اور سائنس کی یہ دریافتیں انسان کے اسی خواہش اور تجسّس کے نتیجہ کے طور پر آئیں جو اس میں پنپ رہی تھیں جو باتیں فلسفہ اور سائنس میں غیر واضح تھیں ادب میں نئی روایات کے طور پر سامنے آئیں اور عوام کو بھی اپنے اثر میں لینے کا کام انجام دینا شروع کر دیا۔ چونکہ ادب میں انتشار کی کیفیت اور سوالات کی جستجو سے جو جوابات نتیجے کے طور پر سامنے آتے ہیں وہ ادب میں نئے رجحان کے فروغ کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

9.3.3 تحریک اور رجحان میں فرق

تغیر وتبدل کی خواہش وجستجو ایک عام فرد تک محدود رہے تو اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوتی تاہم اگر اس خواہش اور جستجو کی تکرار لاشعوری طور پر تخلیقات میں نظر آنے لگے تو اسے بالعموم رجحان کا نام دیا جاتا ہے اور اگر اس انفرادی رجحان میں مختلف افراد کے نظریات وخیالات بھی شامل ہوجائیں تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور یہ رجحان نسبتاً وسیع طبقے کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ ایسے صحت مند رجحان کی مثال ایک مینارۂ نور کی طرح ہوتی ہے جس کی اپنی کرنوں کی روشنی سے ایک بڑا حلقہ پُرنور ہوجاتا ہے جو اپنی روشنی سے بہت سے افراد کی رہنمائی کرتا ہے۔ رجحان کا عمل تیز رفتاری سے کام نہیں کرتا بلکہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کا ذہن کسی خاص نظریات کی جانب مائل کرتا ہے اور ان خیالات کو منقلب کرنے اور اپنا ہم نوا بنانے کی سعی کرتا ہے۔ جب ان تقاضوں کی تکمیل اور حالات کے پیش نظر کسی رجحان کا اثر معاشرے کے ایک وسیع طبقے کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ تو پھر اس رجحان سے نئی تحریک کے اثرات رونما ہونے لگتے ہیں۔ اور رجحان کے مخفی عزائم کو مقصدیت کے جامے میں لے کر کسی خاص سمت میں متحرک ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا رجحان اور تحریک میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ رجحان زیادہ تر بے نام اور بے لوث ہوتا ہے۔ لیکن تحریک واضح طور پر خود کو منکشف کرتی ہے۔ دوسرے رجحان بے سمت ہوتا ہے جبکہ تحریک کسی تیز رفتار دریا کی طرح کسی خاص سمت میں رواں دواں ہوتی ہے۔ پس رجحان جس تغیر وتبدل کے لیے زمین ہموار کرتا ہے، تحریک اس کی تکمیل کے لیے میدان عمل میں سرگرم عمل ہوکر جنگ لڑتی ہے اور بالآخر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہے۔

رجحان سے تحریک تک کے اس سفر میں ہر تحریک اپنا دائرۂ عمل خود وضع کرتی اور ایک معینہ حدود میں رہ کر پورے معاشرے کی موجود حالات کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ رجحان کو پیدا کرنے میں جو کوشش ہوتی ہے اسے تحریک کی سمت لے جانے میں اور معاشرے میں مقبول بنانے کے لیے اجتماعی کوشش بے حد ضروری ہوتی ہے، چونکہ تحریک انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل کی متقاضی ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں کسی سرگرم تحریک کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تو وہاں پر وابستگان تحریک کی فکری ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی بھی ضرور ہوتی ہے۔

9.3.4 تحریک سازی اور رجحان سازی کے عوامل

تاریخ وتہذیب کے مختلف ادوار میں، وجود میں آنے والی مختلف مذہبی، سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکوں کے مطالعہ سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے۔ کہ ان تحریکوں کی کامیابی میں ان کے پیروکاروں کی کڑی محنت، جذبہ ایثار اور مقصد کو منزل تک پہنچانے کی خواہش بڑی شدت سے موجود تھی۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی کامیاب تحریک منظر عام پر آئی، تو اس کے وابستگان نے تحریک میں نہ صرف طغیان پیدا کیا ہو، بلکہ وہ مسلسل عمل پیرا رہے اور دوسروں میں بھی جوش ولولہ پیدا کرتے رہے، جس کو کسی تحریک کی کامیابی کی زندہ مثال کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

اس حقیقت کو بھی ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے۔ کہ مختلف ادوار میں وجود میں آنے والی تحریکوں کے لیے جو زمین ان رجحانات نے تیار کی ہیں۔ اسی زمین پر یہ تحریکیں اپنے نظریات کی ترویج واشاعت کرتی رہی ہیں۔ کیونکہ بیشتر تحریکوں نے اپنے وابستگان میں نظریات کے بارے میں عصبیت بھی پیدا کی اور اپنے رویوں میں شدت پیدا کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ ایسے رویے بالعموم انقلابی تحریکوں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اور تحریک کے کارفرما، اکثر ان تحریکوں کے مقاصد کے حصول اور ان کو فروغ دینے کے لیے راہیں ہموار کرتے رہے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تحریک کے بنیادی مقاصد کے حصول میں تقدیس کو اہم عنصر کی طرح قبول کرلیا جائے تو عصبیت بہت جلدی جڑ پکڑ لیتی ہے اور اس کا دائرہ عمل اور اثرات بھی وسیع ہوجاتے ہیں اور تحریک کے پیروکار شدت کے ساتھ اپنے نظریاتی اعتقاد کو پختہ کر کے مقاصد کی تکمیل کر لیتے ہیں۔ قدیم معاشروں میں ٹوٹم (Totum) کا تصور تقدیس کے عناصر اور عصبیت کے اس طبعی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔

آج ماضی قریب وبعید کی بعض مقبول تحریکوں کا جائزہ لیا جائے، تو محسوس ہوگا کہ تحریک ٹوٹم پرستی کے رجحان سے گہری مماثلت رکھتی ہے۔ وہ اس لیے کہ تحریک میں بھی مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے افراد ہوتے ہیں۔ یہ تمام افراد کسی ایک نظریہ یا خیال پر اتفاق کر لیتے ہیں بے شک ان کا باہمی خون کا رشتہ نہ ہو اور نہ ہی ایک فکر سے آئے ہوں۔ اسی طرح تحریک سازی کے معاملے پر بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے، مختلف خیالات ونظریات کے افراد بھی جب کسی تحریک کے منشور میں موجود اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے یکجا ہوتے ہیں تو ان کی تکمیل کے لیے بیک وقت مفقود جاتے ہیں۔

رجحان سازی سے لے کر تحریک سازی تک کے اس ارتقائی دور میں تحریک کی پیدائش اور فروغ کا عمل ایک بڑی حد تک انسان کے طبعی رجحان سے شروع ہوجاتا ہے۔ جس کی جڑیں انسانی معاشرے میں بہت گہرائی میں پیوست ہیں۔ تبدیلی اور تغیرات کی اس یکساں خواہش کے باوجود تمام تحریکیں کسی ایک ہی سمت میں سفر نہیں کرتیں، بلکہ تحریک کی سمت اس رجحان کی رہین منت ہوتی ہے، جن کے حصول کے لیے عوام الناس کو حالات بدلنے پر مائل کیا جاتا ہے۔ اگر کسی تحریک کا مقصد جامد معاشرے کو پیش پا افتادہ تصورات سے نجات دلانے اور نئی راہ پر گامزن کرنے کے لیے ہو تو تحریک کا خطہ عمل آگے کی جانب بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اور تحریک ماضی کے رجحان سے قطع تعلق کر کے مستقبل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس صورت میں عموماً پرانی روایت یا رجحان شکستہ ہوجاتے ہیں اور تحریک کسی نئی روایت کو جنم دینے اور اور اسے وسیع پیمانے پر مقبول بنانے کی کوشش پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ اس صورت میں سابقہ آزمودہ روایت کے

ٹوٹے ہوئے ضابطوں پر دوبارہ عمل کیا جاتا ہے۔ جہت کے اعتبار سے اول الذکر تحریک ترقی کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔ مؤخر الذکر تحریک احیاء اور تجدید کے لیے کوشاں ہوتی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں تحریک سازی اپنے وجود کی قلب ماہیئت کرتی نظر آتی ہے۔ اور مقصد کے حصول کے ساتھ تحریک سازی کا یہ دور، جو رجحان سازی سے شروع ہو کر تحریک سازی تک مکمل ہو جاتا ہے۔

9.4 خلاصہ

جس طرح ہر معاشرتی تحریک کسی معاشرے کے سکون و جمود میں حرکت پیدا کر کے ایک سماجی انقلاب پیدا کرتی ہے اسی طرح ادبی تحریک ادب میں خاموش اور جمود پڑ چکی لہروں میں تحرک پیدا کر کے اس میں حرارت پیدا کر دیتی ہیں۔ تاہم ادبی تحریک ادب کے جمود کو توڑنے اور اس کی کہنگی کو ختم کر کے تنوع پیدا کرنے کا عمل ہے۔ اس اکائی میں ادبی تحریکات کے ان تمام محرکات پر بحث کی گئی ہے جن کا تعلق اس کی حرکت کے عمل سے ہے۔

اس میں یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کسی تحریک کی کامیابی کا تعلق ان متعلقہ تحریکوں کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے جنھیں کوئی تحریک اپنے گم ہونے سے قبل ان متعلقین کے حوالے کر جاتی ہے۔ اس کی کامیابی میں ان عوامل کا بھی بڑا کردار ہوتا ہے جن کے پیش نظر یہ تحریکیں جنم لیتی ہیں اور ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ تاہم کسی تحریک کی کامیابی میں زمانے اور حالات کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو کسی تحریک کے وجود کے جواز اور اس کے ارتقائی نمو کے لیے مناسب زمین تیار کرتے ہیں۔ ادب میں مغرب کے اثر سے ایک نیا رجحان عمل میں آیا جو جدیدیت کے بدلے کے طور پر مروج ہونے کی کوشش میں اپنی فنی شناخت میں ایک نئی روایت کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ موجودہ تمام حالات، سیاسی اور ادبی ماحول اور زندگی پر اس رجحان کے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ رجحان موجودہ ماحول میں نئی فکر اور نئے حالات سے عوام کو بیدار کرتا ہے۔ اور اپنے طرف راغب کرتا ہے۔

رجحانات مختلف علوم کے نظریات و خیالات کو اجاگر کرتا ہے لیکن ان کا نقطہ اشتراک مختلف ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ یہ نظریات کے تصادم یا ادغام سے ادب کا کوئی نیا نظریہ وضع وجود میں لانے کی کوشیش کرتا ہے۔ ادب چونکہ زندگی کو اپنا موضوع بناتا ہے تاہم جو نظریات دیگر کسی بھی عہد میں فروغ حاصل کرتے ہیں، وہ ادب میں ضم ہو جاتے ہیں اور اس طرح نئی تخلیقات میں ان کے عکس نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

اس طرح اسے ادبی نظریات کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ جنھیں اب تک سائنسی علوم میں تجرباتی طور پر استعمال کیا جاتا ہوا ہمیں نظر آتا ہے۔ ادبی رجحانات اپنی تخلیقات کے ذریعہ عوام الناس کو اپنے نظریات و خیالات کی جانب متوجہ اور راغب کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ابی تحریکات و رجحانات زبان و اسلوب پر بھی اپنے دیرپا نقوش ثبت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ تمام رجحانات لفظ اور زبان کے ذریعہ عوام تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان تمام حالات کا جائزہ لے کر ان کو ادب کے ذریعہ اپنے تحریک کا حصہ بناتے ہیں۔ اس میں خیالات و نظریات کی ترویج و اشاعت کر کے ادب پر اپنے اثرات مرتب کر سکیں۔ اس کے لیے زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو تلاش کیا جاتا ہیں۔ پیش یا افتادہ اور پرانے پڑ گئے الفاظ کو ترک کر کے نئے ذخیرۂ الفاظ کا استعمال، ترکیبوں کے تنوع اور بندشوں کے علاوہ ان تمام تشبیہات، استعارات اور علامات کو خوب سے خوب تر استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادبا اور شعرا ان الفاظ کے ذریعہ نئے حلقے تشکیل دیتے ہیں۔ اس طرح ان رجحانات و تحریکات کے ذریعہ اپنے دیرپا اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں۔

9.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سے بیس سطروں میں تحریر کیجیے۔

(۱) ادبی تحریکات کا تعارف پیش کیجیے؟

(۲) ادبی وعوامی تحریکات کا جائزہ لیجیے۔

(۳) ادبی تحریکات کو کس طرح کامیاب بنایا جاسکتا ہیں؟

(۴) اردو ادب کے ادبی رجحان کا جائزہ لیجیے؟

(۵) رجحان کے اردو ادب پر کس طرح اثرات مرتب ہوئے واضح کیجیے؟

(۶) تحریک سازی اور رجحان سازی کے درمیان فرق واضح کیجیے؟

9.6 فرہنگ

الفاظ	معنی
منسلک	پرویا ہوا۔جڑا ہوا۔
صحافتی	صحافت سے تعلق ہونا۔
تقویت	طاقت
ذہنیت	مزاج،ذہنی رجحان
معاونت	مدد
عموماً	عام طور پر
زوال	مٹ جانا
تغیر	تبدیلی

9.7 شفارش کردہ کتابیں

(۱) نئے ادبی رجحانات — ڈاکٹر اعجاز حسین

(۲) اردو ادب کی تحریکیں — ڈاکٹر انور سدید

(۳) ادبی تحریکات ورجحانات — ڈاکٹر انور پاشاہ

(۴) ترقی پسند تحریک کی نصف صدی — علی سردار جعفری

(۵) مقدمۂ شعروشاعری — مولانا الطاف حسین حالی

(۶) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے 2000 تک) ڈاکٹر سلیم اختر

(۷) تحریکات اور رجحانات — ڈاکٹر انور پاشا

(۸) تحریکات اور رجحانات — ڈاکٹر انور پاشا

(۹) ادبی تحریکات — ڈاکٹر ساجد علی قادری

اکائی ۱۰ : علی گڑھ تحریک

اکائی کے اجزاء

10.1 مقاصد
10.2 تمہید
10.3 موضوعات
10.3.1 علی گڑھ تحریک کا تعارف
10.3.2 علی گڑھ تحریک کے اردو ادب پر اثرات
10.3.3 علی گڑھ تحریک سے وابستہ نثر نگاروں کا جائزہ
10.3.4 علی گڑھ تحریک کی شعری ادب
10.3.5 علی گڑھ تحریک کی شہرت
10.3.6 چند تحریکات کا پس منظر
10.4 خلاصہ
10.5 نمونے کے امتحانی سوالات
10.6 فہرہنگ
10.7 شفارش کردہ کتابیں

10.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے بعد طلباء سے۔۔۔
☆ علی گڑھ تحریک سے واقف ہوسکیں گے۔.
☆ علی گڑھ تحریک سے وابستہ نثر نگاروں سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ علی گڑھ تحریک کی شعری ادب اور منتخب تحریکات کا جائزہ لے سکیں گے۔

10.2 تمہید

اردو زبان وادب کے طالب علم کی حیثیت سے مختلف ادبی تحریکات سے واقفیت ضروری ہے اور ان تحریکات میں علی گڑھ تحریک اہم مقام رکھتی ہے۔علی گڑھ تحریک 1857ء کی جنگ آزادی کی دین ہے۔اس جنگ آزادی کیے بعد علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خان کی زندگی کا دھارا دوسری سمت میں رواں ہوگیا۔اس تحریک نے ہندوستان میں مسلمانوں کی سربلندی کا کام کیا اس کے

علاوہ اردو زبان وادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔اسی تحریک کے نتیجے میں 'مدرسۃ العلوم' کی بنیاد پڑی جس نے آگے چل کر مرکزی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔آج وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے معروف ہے۔اس یونیورسٹی نے ہر میدان میں مردان کار تیار کیے۔سرسید احمد خاں نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کا اہم کام کیا اور اردو زبان وادب کو نئے اسالیب بیان عطا کیے، جس سے اردو زبان کو وسعت ملی اور اردو نثر نکھری ہوئی شکل میں سامنے آئی۔علی گڑھ تحریک نے اردو نثر کو مقفّیٰ و مسجع اسلوب سے نجات دلا کر سادگی ومتانت، وقار وسنجیدگی عطا کی جس سے اردو نثر کو ایک نئی جہت ملی۔سرسید احمد خاں نے خود اردو زبان وادب کی ترقی میں حصہ لیا اور اپنے رفقا سے بھی مختلف موضوعات وعنوانات پر مضامین ومقالے، تصنیفات وتالیفات لکھوائیں۔اردو مضمون نویسی کے اولین نمونے اسی تحریک کے زیر اثر وجود میں آئے۔سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے اردو مضمون نویسی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

علی گڑھ تحریک ایک جامع تحریک تھی۔اس تحریک نے ادبی، سماجی، اخلاقی، تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں کام کیا مگر اردو زبان وادب میں علی گڑھ تحریک کی خدمات اہم مقام رکھتی ہیں اور آگے چل کر علی گڑھ تحریک سے مراد اردو زبان وادب کی تحریک ہی لی جانے لگی اور اردو زبان وادب میں اس تحریک کی خدمات اس قدر نمایاں ہیں کہ علی گڑھ تحریک کے تذکرہ کے بغیر اردو زبان وادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

10.3 موضوعات

10.3.1 علی گڑھ تحریک کا تعارف

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں تھے۔ سرسید احمد خاں نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت مغلیہ کا آخری دور تھا۔ سرسید احمد خاں کا خاندان شاہی دربار سے کافی عرصے تک وابستہ رہا۔سرسید احمد خاں نے خود دربار کی آرائش وزیبائش کا منظر دیکھا تھا۔ سلطنت مغلیہ کا چراغ ان کی آنکھوں کے سامنے گل ہوا۔شاہان مغلیہ اور شہزادوں کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔1857ء کے ہنگامے اور مسلمانوں کی زبردست تباہی اور بدحالی کا منظر ان کے سامنے تھا۔1857ء کے واقعات نے سرسید احمد خاں کو بہت متاثر کیا۔اہل وطن کی تباہی وبربادی سے سرسید بہت دل برداشتہ تھے۔سرسید اپنی قوم کا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔اس سلسلے میں انھوں نے متعدد مضامین لکھے، رسائل وجرائد جاری کیے۔قوم کی فلاح وبہبود کے لیے ادارے قائم کیے انھیں تمام کوششوں اور کاوشوں کے مجموعے کو علی گڑھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ علی گڑھ تحریک 1857ء کی تباہی وبربادی کی تلافی کی ایک کوشش تھی۔علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر ایک اصلاحی تحریک تھی، جس کا اہم مقصد مسلمانوں کی خامیوں کا ازالہ کر کے انھیں ترقی وعروج کی منازل تک پہنچانا تھا۔سرسید اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔وہ مسلمانوں کو عصر جدید کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے اور جہالت، بے علمی اور دیگر اخلاقی عیوب ونقائص سے نجات دلانا چاہتے تھے اور ادب، سلیقہ، اعلیٰ طرز معاشرت سکھانا چاہتے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس وقت انگریزوں نے اپنا رکھی تھیں اسی لیے سرسید احمد خاں

انگریزوں کی تہذیب وتمدن، اخلاق معاشرت اور علوم وفنون کی اچھی باتوں کے مداح وداعی تھے۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سرسید نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میدانِ جنگ میں انگریزوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اس لیے انگریزوں کی اچھی چیزوں سے استفادہ کر کے عمدہ معاشرت اور مہذب زندگی گزاری جائے تا کہ اہل وطن خصوصاً مسلمان ملک ہندوستان میں عزت کی زندگی گزار سکیں اور ملک کی تعمیر وترقی میں برابر کے حصے دار ہوں۔ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ترقی اور تہذیب وتمدن، علوم وفنون، مغربی زبان وادب سے فیض یاب کرنے کا خاکہ بنانے کے لیے 1869ء میں انگلینڈ کا سفر کیا۔ اس سفر کے اہم مقاصد مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا منصوبہ پیش کرنا، آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنا تھا۔ سرسید انگلینڈ سے واپسی کے بعد 4/مئی 1875ء کو 'مدرسۃ العلوم' مسلمانانِ ہند کا قیام کیا، جو ترقی کے منازل طے کرتا ہوا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج پھر 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ہر میدان میں مردان کار پیدا کیے۔ اردو زبان وادب کے ادبا کی ایک کہکشاں تیار کردی۔ سیاسی میدان میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین، موجودہ نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری اور مختلف ممالک کے سابق سربراہان کے نام نمایاں ہیں۔ سول سروسیز، تجارت اور کھیل کے میدان میں بھی اہم شخصیتیں پیدا کیں۔ آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تعلیمی، ادبی، سماجی واخلاقی، سیاسی، ثقافتی میدانوں میں اہم خدمات انجام دے رہی ہے اور فرزندانِ علی گڑھ ساری دنیا میں مادرِ علمی کا نام روشن کر رہے ہیں۔

10.3.2 علی گڑھ تحریک کے اردو ادب پر اثرات

علی گڑھ تحریک نے اردو ادب پر ہمہ گیر اثرات مرتب کیے۔ سرسید احمد خاں کے تصورات نے اردو ادب کو ایک نئی سمت عطا کی۔ سرسید ایک مصلح تھے اس لیے انھوں نے اردو زبان وادب کو محض تفنن طبع اور بے کار کے مشغلوں سے باہر نکالا اور اردو زبان وادب میں زندگی کے حقائق اور معاشرتی واخلاقی پہلو کو اجاگر کیا اور اپنے مضامین کے ذریعہ اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کو مغربی علوم وفنون سے بہت فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کیا۔ علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کو فارسی زبان وادب کے رجحانات سے آزاد کرانا اور اردو ادب کو عام بول چال کی زبان میں تحریر کرنے کی کامیاب کوششیں سرسید اور ان کے رفقا نے کی۔ اس تحریک مقفّیٰ ومسجع عبارتوں سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے مشاہدات، تجربات وخیالات ومطالعات کو عام فہم اور سلیس لیکن مؤثر انداز میں پیش کرنے کا عملی نمونہ پیش کیا۔ سرسید ادب کو بے کاری اور فضول عبارت آرائی سے باہر نکالنا چاہتے تھے اور اردو ادب کو زندگی اور سماج کا بہتر بنانے کا اہم ذریعہ خیال کرتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کی جدوجہد کے زیر اثر انگریزی زبان وادب کی متعدد اصناف ادب ناول، تنقید، انشائیہ، سوانح عمری، مختصر افسانہ وغیرہ اردو میں رائج ہوئے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے 'تہذیب الاخلاق' میں سماجی، اخلاقی، علمی، ادبی، سیاسی موضوعات پر مضامین لکھے ان مضامین میں عبارت آرائی، لفاظی، مقفّیٰ ومسجع جملوں سے احتراز کیا جاتا تھا۔ اسلوب وبیان سادہ، عبارت سلیس اور عام فہم ہوتی تھی۔

بقول رشید حسن خان

''علی گڑھ تحریک ایک علمی ،ادبی، اصلاحی تحریک تھی جس کے بڑے دوررس اور ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے بقول مولانا شبلی ملک میں آج بڑے بڑے انشاء پرداز موجود ہیں، جو اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمراں ہیں،لیکن ان میں ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بااحسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔بعض نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا۔تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے ہیں۔'' (سرسید مرحوم اردو لٹریچر،مشمولہ انتخاب مضامین سرسید مرتب رشید حسن خاں)

علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کے نثر و نظم دونوں میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔اس تحریک سے نثری ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جو سرسید نے نثری ادب میں قسم بہ قسم کے گل بوٹے کھلائے ،مختلف موضوعات پر عمدہ مضامین لکھے جو متعدد ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں جو سلیس عبارت اور روانی کا ذخیرہ ہیں۔سرسید کو قدرت نے مخلص رفقاء تحریک عطا فرمائے جن کے اندر تصنیفی و تالیفی صلاحیتیں اعلیٰ درجہ کی موجود تھیں اس تحریک کے ذریعہ بہت سے ادیبوں کی خفیہ صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور سرسید اور ان کے رفقاء کار نے قومی،علمی، عالمی، سماجی مسائل پر کتب و مضامین نصیب کیے۔سرسید کے رفقا کار میں نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی ،نواب وقار الملک، الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، وحید الدین سلیم وغیرہ شامل ہیں۔ان رفقاء کار کی نثری خدمات نہایت اہم ہیں۔ان رفقاء کار کے بعد علی گڑھ تحریک جو مردان کار پیدا کیے انھوں نے بھی اردو نثر کی ترقی و فروغ میں اہم حصہ لیا۔ان میں سے خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق، مولوی عزیز مرزا، عنایت اللہ دہلوی قابل ذکر ہیں۔

ان حضرات کی نثری خدمات اردو زبان وادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔علی گڑھ تحریک کے زیر اثر سرسید کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے والوں میں بعد کی نسل کے لوگ بھی شامل ہیں۔جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ان میں سے صحافتی میدان میں نثری خدمات انجام دینے والوں میں حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، طفیل احمد منگلوری اہم نام ہیں۔ خالص اردو ادب کی خدمت انجام دینے والوں میں محفوظ علی بدایونی، عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، مہدی افادی، قاضی عبدالغفار کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو کا نثری ادب کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے جو نسل در نسل باقی رہا اور علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید اور ان کے رفقاء اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر پروان چڑھنے والی دیگر شخصیتوں نے نثری ادب میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔

علی گڑھ آج بھی اردو کے نثری ادب میں اہم اضافے کر رہا ہے۔ ماضی قریب میں رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور وغیرہ کی بھی نثری ادب میں اہم خدمات ہیں۔آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبہ اردو ہندوستان کا عظیم شعبہ ہے۔اس کے اساتذہ اردو کے نثری سرمایہ کو مالا مال کر رہے ہیں۔

10.3.4 علی گڑھ تحریک سے وابستہ شعری ادب

علی گڑھ تحریک نے نثری ادب کی طرح شعری ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ سرسید نے شعروادب کو بامقصد اور زندگی کے حقائق بیان کرنے والی شئے قرار دیا ہے اور اردو شاعری کو زندگی اور معاشرہ کو فائدہ پہنچانے والی چیز بتلایا ہے۔ اس کا ثبوت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھی جانے والی نظمیں ہیں جو زندگی، معاشرہ، سماج اور قومی شعور سے متعلق ہوتی تھیں۔ علی گڑھ تحریک سے پہلے اردو شاعری میں یہ چیزیں مفقود تھیں۔ سرسید نے اردو نظم کو حیات وکائنات کے مسائل کی بھرپور ترجمانی کرنے کی وکالت بھی کی ہے۔ حقائق زندگی اور احوال زندگی کی فطرت یا قدرت سے مطابقت عمل اور ترقی کی اہمیت اردو شاعری کا تہذیب وتمدن اور معاش سے ربط وضبط عقل ودانش کی برتری انسان اور سماج کا تعلق علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ادب میں فروغ پانے والے موضوعات تھے۔ سرسید شعروادب کو عوامی زندگی کا ترجمان اور اصلاحِ معاشرہ کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے جس کی عمدہ مثالیں حالی، شبلی، نذیر احمد، مہدی افادی وغیرہ کی نظموں میں بخوبی ملتی ہیں۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ شعرا میں حالی سب سے اہم نام ہے۔ حالی نے سرسید کی خواہش پر 'مسدس حالی' لکھی اور 'مقدمہ شعروشاعری' علی گڑھ تحریک ہی کے بنیادی اصولوں کی توضیح وتفسیر ہے۔ مثنویاتِ حالی کی اکثر نظمیں علی گڑھ تحریک ہی کے زیر اثر وجود میں آئیں۔ 'نشاط امید'، 'برکھارت'، 'حب وطن'، 'مناجات بیوہ' وغیرہ میں علی گڑھ تحریک ہی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر دوسرے اہم شاعر علامہ شبلی طویل عرصے تک علی گڑھ سے وابستہ رہے اس لیے ان کی شاعری میں علی گڑھ کے اصول ونظریات کی جھلک نظر آتی ہے، علامہ شبلی کی 'صبح امید'، 'تماشائے عبرت' وغیرہ میں علی گڑھ تحریک کی روح جلوہ گر ہے۔ علی گڑھ تحریک کی ایک اہم شخصیت نذیر احمد کی بھی ہے جنھوں نے سرسید تحریک کے زیر اثر شاعری میں بھی حصہ لیا۔ انھوں نے سرسید کے حق میں قوم کے **مسیحا سرسید احمد خاں** کے احسانات اور مرتبہ سید احمد خاں جیسی نظمیں کہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر نظموں میں بھی سرسید کے اصول ونظریات کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ان اہم شعرا کے علاوہ علی گڑھ تحریک کے شعری ادب میں اضافہ کرنے والوں میں وحیدالدین سلیم، مفتی محمد ناظر، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی گوہر، مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اقبال سہیل وغیرہ شامل ہیں، جنھوں نے علی گڑھ تحریک کے شعری ادب کو مالا مال کیا ہے۔

مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اقبال سہیل وغیرہ اردو زبان وادب کے نامور شعرا میں سے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی عظیم مجاہد آزادی تھے۔ ان کی شاعری کو اردو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ دیگر شعرا بھی اہم مقام کے حامل ہیں۔

10.3.5 - علی گڑھ تحریک کی شہرت

علی گڑھ تحریک ایک عظیم تحریک تھی، جس نے اردو کی ادبی تحریکوں میں نمایاں مقام حاصل کیا اور اردو زبان وادب پر سب سے زیادہ ہمہ گیر اثرات ڈالے۔ علی گڑھ تحریک کے مجموعے میں ادبی، سماجی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی وتمدنی اور تعلیمی گوشے شامل ہیں۔ اس

لیے علی گڑھ تحریک کی شہرت کو بقائے دوام حاصل ہے۔علی گڑھ تحریک نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے ذریعہ تعلیمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شہرت آج نصف النہار پر ہے اور اردو زبان وادب کی بقا اور ترقی وترویج کا یہ یونیورسٹی آج بھی اہم مرکز ہے۔

اردو زبان وادب پر جس قدر گہرے اثرات اس تحریک نے مرتب کیے ہیں اس قدر کسی دوسری تحریک کے اثرات نظر نہیں آتے۔اردو زبان وادب کے اساطین وعناصر خمسہ سرسید احمد خاں،حالی،شبلی،نذیر احمد،محمد حسین آزاد اسی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں جن کے احسانات سے اردو زبان وادب تا قیامت گراں بار رہے گی۔ان اردو زبان وادب کی عظیم شخصیتوں کی خدمات اور شہرت لازوال ہے جس سے بخوبی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کی شہرت عظمت کی قدر ان اساطین کے علاوہ دیگر علی گڑھ سے وابستہ شعرا واد با بھی اردو زبان وادب میں اونچا مقام رکھتے ہیں جن کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے جو علی گڑھ تحریک کی شہرت میں چار چاند لگاتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک نے اردو زبان وادب کے علاوہ تعلیمی،سماجی،تہذیبی وثقافتی اور سیاسی میدانوں میں بھی بہت شہرت حاصل کی اور ہر میدان کے رہنما و نامور افراد تیار کیے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔اس طرح علی گڑھ تحریک کی شہرت عالمگیر ہے اور عوام وخواص اس کی خدمات اور افادیت کے مترادف ہیں اور علی گڑھ سے وابستگی اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

10.3.6 - چند اہم تحریکات کا پس منظر

علی گڑھ تحریک 1857ء کے پس منظر میں برپا ہونے والی عظیم تحریک تھی جو مسلمانوں کی اصلاح وترقی کے لیے وجود میں آئی اور ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں اثرات مرتب کیے۔سماجی اور ادبی میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔غور وفکر،تدبر وتفکر،تہذیب وتمدن،رہن سہن،طور طریق سب میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی جو اس تحریک سے پہلے ناپید تھی۔علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو 1857ء کی ناکامی کے گہرے غم واندوہ سے نجات دلائی۔آپسی اختلافات کو ترک کر کے تعلیم وتعلم کا راستہ دکھلایا عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں اہم اقدامات کیے غرض سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس تحریک نے کام کیا اردو زبان وادب تو اس تحریک کے بانی اور ان کے رفقا ہی کی رہین منت ہیں۔علی گڑھ تحریک کی ادبی خدمات کی برابری کوئی دوسری تحریک نہیں کرسکتی۔اسی تحریک کی بدولت شاعری کو جدید معنی ومفہوم اور لب ولہجہ عطا ہوا۔تنقید میں نئے رجحانات پیدا ہوئے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو زبان مقفّیٰ ومسجع اور عبارت آرائی سے آزاد ہوگئی اور اسے رواں دواں اور عام فہم نثر کا تحفہ عطا ہوا اسی تحریک کے زیر اثر مضمون نگاری ،مقالہ نویسی ، ناول نگاری اور افسانہ نگاری جیسی اصناف اردو زبان وادب میں شامل ہوکر مقبول عام ہوئیں۔رسالہ 'تہذیب الاخلاق' نے علمی وفکری،ادبی وقومی سطح پر اہم خدمات انجام دیں۔علی گڑھ تحریک کے امکانات میں یہ بات شامل ہے کہ جس طرح علی گڑھ تحریک نے 1857ء کے بعد مسلمانوں کو سماجی اور علمی،معاشرتی وتہذیبی سطح پر عروج حاصل کیا تھا۔انھیں خطوط پر آج بھی مسلمانوں کی ترقی کی

راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔علی گڑھ تحریک کے زیر اثر قائم علی گڑھ یونیورسٹی تعلیم وتعلم ،تہذیبی وادبی تناظر میں اہم مقام رکھتے ہیں اور گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ سرسید کا جاری کردہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' علمی ،ادبی، سماجی، معاشرتی پہلوؤں پر عمدہ مضامین شائع کر کے سرسید کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر رہا ہے۔اردو زبان وادب میں جو اصول وضوابط ،افکار ونظریات سرسید اوران کے رفقا حالی،شبلی، آزاد اور نذیر احمد نے قائم کیے تھے۔ وہ آج بھی اردو زبان وادب کے زریں اصول ہیں جن کی نظیر آج تک پیش نہیں کی جاسکی۔سرسید اوران کے رفقاء کے نقش قدم پر چل کر اردو زبان وادب کو نئی بلندیوں تک پہنچایا جاسکتا ہے علی گڑھ تحریک کا یہی سچا پیغام ہے اور نئی تحریک کو سچی خراج عقیدت ہے۔

علی گڑھ تحریک وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جس نے 1857ء کی تباہی و بربادی، ذلت وخواری کو بہت حد تک کم کیا اور مسلمانوں کی ترقی اور عروج پر پہنچانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ جدید تعلیم کا رواج علی گڑھ تحریک ہی کی دین ہے۔علی گڑھ تحریک نے تعلیم نسواں پر بھی توجہ دی جس سے مسلم عورتوں میں تعلیمی بیداری پیدا ہوئی۔اس تحریک نے 1857ء کی تباہ حالی کی بھرپائی کردی اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا۔

10.4 - خلاصہ

علی گڑھ تحریک اس وقت وجود میں آئی جب کہ سارے ہندوستان تباہی و بربادی سے دوچار تھا۔ جنگ آزادی کی تمام کوشش بیکار ثابت ہوچکی تھی سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو چکا تھا سارا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا اس وقت مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے اور انھیں تباہی و بربادی سے نجات دلانے کے لیے سرسید نے علی گڑھ تحریک قائم کی اس علی گڑھ تحریک نے مختلف ادارے قائم کیے۔سرسید کے رفقاء نے صحافت ، اردو زبان وادب کی جملہ اصناف پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ سوانح ،تنقید، ناول،خطوط، مقالہ نگاری وغیرہ نثری اصناف کے فروغ میں علی گڑھ تحریک کا اہم حصہ ہے۔علی گڑھ سے وابستہ تحریک کی شہرت اردو زبان وادب کی تمام تحریکات سے زیادہ ہے۔علی گڑھ تحریک نے تعلیمی،سماجی،اقتصادی، دینی، مذہبی،صحافتی،ادبی تمام میدانوں میں کام کیا۔علی گڑھ تحریک کے امکانات بھی بہت ہیں۔آج علی گڑھ تحریک کے اصول وضوابط اور افکار ونظریات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ تحریک ایک اہم تحریک تھی اس کے دوراس اثرات بڑے ہیں اس نے تمام میدانوں میں کام کیا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو شاعری کو قواعد وضوابط عطا ہوئے اور اردو نثر میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری کو نئی ساخت وہیئت نصیب ہوئی۔ اردو نثر کو باوقار،سنجیدہ اور متوازن معیار ملا۔مضمون نگاری صحیح اور اچھے مقاصد کے لیے استعمال کی جانے لگی۔علی گڑھ تحریک کی سماجی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔اس تحریک نے غور وفکر،تفکر وتدبر،تہذیب وتمدن، ثقافت ومعاشرت میں انقلاب برپا کیا اور تعلیمی میدان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے ذریعہ تعلیم وتدریس کا ذوق عام ہوا۔جدید تعلیم کے حصول کے ذریعہ مسلمان انگریزوں اور ہم وطنوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لائق ہوئے۔

10.5 نمونے کے امتحانی سوالات

(۱) علی گڑھ تحریک کا اردو ادب میں مقام متعین کیجیے۔

(۲) علی گڑھ تحریک کے قیام کا مقصد کیا تھا، بیان کیجیے۔

(۳) رسالہ 'تہذیب الاخلاق' نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر کیا خدمت انجام دیں، مفصل بیان کیجیے۔

(۴) تحریک سے وابستہ ادیبوں کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

(۵) علی گڑھ تحریک سے وابستہ شاعروں پر مفصل نوٹ لکھیے۔

10.6 فہرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مرکزی جامعہ	سینٹرل یونیورسٹی	مشاہدات	تجربے، غور خوض
مردان کار	مجاہد	احتراز	پرہیز، کنارہ کشی، بچاؤ
اسالیب	اسلوب کی جمع، انداز، طریقے	دوررس	دور بیں
مقفّیٰ	جس میں قافیے لائے جائیں	ضخیم	بڑا، موٹا، بڑے حجم والا
مسجّع	وہ بڑی عبارت جس کے جملے ہم قافیہ ہوں	مفقود	وہ چیز جو غائب ہو، غیر موجود چیز یا امور
رفقاء	رفیق کی جمع، ساتھی، دوست	توضیح	واضح کرنا، کھول کر بیان کرنا
دل برداشتہ	غمگین، آزردہ	نصب النہار	دوپہر کا وقت، دن کا نصف
ازالہ	زائل کی جمع، دور کرنا، مٹانا	گراں بار	بھاری بوجھ، لدا ہوا، پھل لانے والا

10.7 شفارش کردہ کتابیں

1. منظر اعظمی — اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ
2. انور سید — اردو ادب کی تحریکیں
3. رام بابو سکسینہ — تاریخ ادب اردو
4. آفتاب عالم — علی گڑھ میگزین
5. ڈاکٹر ساجد علی قادری — تحریکات ورجحانات

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۱۱ : رومانی تحریک

اکائی کے اجزاء

11.1 مقاصد
11.2 تمہید
11.3 موضوعات
11.3.1 رومانی تحریک کا تعارف
11.3.2 رومانی تحریک کا آغاز وارتقاء
11.3.3 یوروپ میں رومانی تحریک
11.3.4 ہندوستان میں رومانی تحریک
11.3.5 رومانی تحریک کے اردو ادب اثرات
11.3.6 رومانی تحریک کا زوال
11.4 خلاصہ
11.5 نمونے کے امتحانی سوالات
11.6 فہرہنگ
11.7 شفارش کردہ کتابیں

11.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔۔۔
☆ رومانی تحریک سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ یورپ اور ہندوستان میں رومانی تحریک کا پس منظر سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ رومانی تحریک کے اردو ادب پر کس طرح اثرات مرتب ہوئے ہیں یہ بتاسکیں گے۔
☆ رومانی تحریک کا زوال کس طرح ہوا یہ بتاسکیں گے۔

11.2 تمہید

رومانویت انگریزی لفظ رومانس سے ماخوذ ہے۔رومانس ادب کے تحت وہ کہانیاں آتی ہیں جس میں عشق ومحبت کے واقعات پرشکوہ اور آراستہ پس منظر میں بیان کی جائیں ۔روسو کی اس اہم آواز کو رومانیت کا مطلع کہا جاتا ہے انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں

دیکھو وہ پابازنجیر ہے۔روسو نے آزادی اور ایک ایسے نئے دور کا آغاز کیا جہاں کائنات خود انسان کے تابع ہے نہ کہ انسان کائنات کے اصول وضوابط کے تابع ہے۔بعد کے ادیبوں نے جدید نظریات اور رجحانات کی ابتدا کی اور رومانوی تحریک ایک اہم تحریک بن کر سامنے آئی جس کی ترقی وترویج میں انقلاب فرانس نے اہم حصہ لیا۔اردو ادب میں رومانوی تحریک کا آغاز تحریک علی گڑھ اور حالی کی اصلاحی تحریک کے بعد ہوتا ہے۔رومانوی تحریک کے نمونے اقبال کی شاعری میں بہت نمایاں طور پر نظر آتے۔ابوالکلام آزاد کی نثر رومانوی انانیت تخیل کی فراوانی اور شدت جذبات کا اعلیٰ ترین مظہر کہی جاسکتی ہے۔اردو زبان وادب میں سجاد حیدر یلدرم کے مضامین نے رومانوی تحریک کا ایک باقاعدہ اسلوب کی طرح آغاز کیا۔یلدرم کے علاوہ نیاز فتح پوری، مجروح گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی، مہدی افادی، سجاد حسین، قاضی عبدالغفار وغیرہ نے اس کارواں کو آگے بڑھایا۔شاعری میں اختر شیرانی رومانوی جذبہ اور تحریک کے سب سے عظیم شاعر ہیں۔اختر شیرانی کے علاوہ جوش ملیح آبادی، احسان دانش، اختر انصاری روش، حامد اللہ افسر، عظمت اللہ خاں وغیرہ اس تحریک کے اہم شاعر ہیں۔

11.3 موضوعات

11.3.1 رومانی تحریک کا تعارف

رومانوی تحریک ایک قدیم تحریک ہے جو مختلف ادوار میں رونما ہوتی رہی۔رومانوی تحریک کا آغاز انقلابی تحریک کی حیثیت سے ہوا۔رومانیت اصول پرستی، عقلیت اور میانہ روی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت ہے۔کلاسیکیت نے دنیا انسان اس کی زندگی اور حسن کو جن خانوں میں بانٹ کر رکھ دیا تھا رومانوی تحریک نے اس پر کاری وار کیا ہے۔رومانوی تحریک کا پہلا دور چار صدی قبل مسیح یونان سے شروع ہوا۔دیوتاؤں کے خلاف بغاوت، آباواجداد سے سرکشی، قدیم نظریات وروایات سے انحراف رومانیت کی مثالیں ہیں۔رومانوی تحریک کا دوسرا دور پہلی صدی قبل مسیح کا لگ بھگ شروع ہوا رومانوی تحریک کے تیسرے دور کی شروعات میں روسو کے نظریات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔اس تحریک کو یورپ میں کرنی پرسی جرمن شاعر ہرڈر سے مقبولیت بخشی۔اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شیکسپیئر نے اس تحریک کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ناول نگاری کے میدان میں منسرائڈ کلف اور ہوریس وال یول ریچڈسن، ورڈزورتھ اور کالرج نے اہم کارنامے انجام دیے۔یورپ میں رومانوی تحریک کا ایک اہم سبب انقلاب فرانس بھی تھا۔رومانوی تحریک نے انگلستان جرمن، فرانس اور دیگر ممالک میں فروغ پایا۔اردو زبان وادب میں شبلی کی تحریروں میں رومانوی تحریک کی جھلک نظر آتی ہے۔علامہ شبلی عقل ودرایت کی اہمیت وضرورت کے باوجود وجدان اور درایت کی اہمیت سے انکار نہ کرسکے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں سلاست اور پرکاری ایک مناسبت سے ہم آمیز ہوئی ہیں۔

رومانوی تحریک کی اردو زبان وادب میں ابتدا جدید تعلیم یافتہ اور نئی نسل کا وہ انداز فکر تھا جو انھیں سرسید اور حالی کے زیر اثر پروان چڑھنے کے باوجود ان کے افکار وخیالات سے بالکل متفق نہ کرسکا۔اس تحریک کو تقویت آزاد اور شبلی کے وسیلے سے عبدالحلیم شرر، ریاض خیرآبادی اور ناصر علی کے انشائیوں سے ملی تو دوسری طرف ٹیگور کے مابعد الطبیعاتی فکر اقبال کی روایت شکنی اور تصور خودی اور

ابوالکلام آزاد کی انانیت اور انفرادیت سے حاصل ہوئی۔سجاد حیدر یلدرم کے مضامین مخزن میں چھپنے شروع ہوئے ان مضامین نے اردو میں رومانوی تحریک کا آغاز کیا۔ یلدرم کی تحریکوں اور افسانوں میں تخیل اور جذبہ کی فراوانی رومانیت کی عکاس ہیں۔ یلدرم کی فکر کا اہم اور بنیادی آہنگ ماورائی ہے ان کا تخیل ارضی نہیں ہے۔ یلدرم کی تخیلی دنیا بیسویں صدی کے یوروپ کے تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتی ہے۔ یلدرم کی تحریروں میں مغربی تہذیب کا پرتو لطافت کے ساتھ ملتا ہے اور دیگر رومانوی تحریک کے ادبا وشعرا کی تحریروں اور شاعری میں یہ تمام خصوصیات کارفرما نظر آتی ہیں۔رومانوی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی، درد اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنادیا۔ رومانویت افراط اور جذباتی انتہاپسندی کی قائل تھی لہٰذا اس درد وکرب کو رومانوی شعرا نے معراج تک پہنچادیا۔مسلمہ اصولوں ہی سے نہیں بلکہ عام زندگی سے انحراف کرنے اور جذبات کو پوری آزادی دینے کی مثال خود رومانوی ادیبوں اور شاعروں کی زندگی پیش کرتی ہے۔رومانویت اصول پرستی،عقلیت اور میانہ روی کے خلاف بغاوت ہے۔کلاسیکی انسان دنیا،اس کی زندگی اور حسن کو جن خانوں میں بانٹ کر اور اصولوں میں تقسیم کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔رومانیت نے اس پر ایک کاری ضرب لگائی،رومانیت ایک انقلابی تحریک کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ یہ تحریک بدلے ہوئے حالات میں کائنات کی ایک نئی تلاش تھی اور نئی قدروں کی بازیافت تھی۔

11.3.2 رومانوی تحریک کا آغاز

رومانوی تحریک کا آغاز صدیوں قبل ہوا۔چار صدی قبل مسیح یونان میں اس کا پہلا اثر نظر آتا ہے۔یونانی شعرا وادبا کے ادب پاروں اور اشعار میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔پہلی صدی قبل مسیح رومانیت کی دوسری تحریک رونما ہوئی مگر رومانیت کی تیسری تحریک جو روسو کے نظریات سے پیدا ہوئی اس نے بڑی ترقی کی۔روسو نے رومانیت کی جو شمع روشن کی تھی اس کی اولین شعاعیں کرنی پرسی نے Reliques of Ancient English Poetry میں اور جرمن شاعر ہرڈر نے Vioces of Nations میں گیتوں کی صورت میں نظر آتی ہیں پھر رومانویت کے یہ عناصر گوئٹے ،برنز،بلیک، کالرج اور ورڈزورتھ کے یہاں نظر آتے ہیں۔انگریزی زبان کے مشہور ومعروف شاعر شیکسپیئر کی مقبولیت نے رومانیت کی اس تحریک کو بہت زیادہ فروغ دیا۔انگریزی ناول نگاروں میں مسٹر رڈکلف اور ہوریس، وال پونی وغیرہ نے رومانی ناولوں کے ذریعہ عوام کا خون گرم کیا۔عہد جدید میں ریچڈسن نے پامیلا اور Sentimental Journey لکھ کر رومانیت کو انتہا پر پہنچادیا۔یوروپ کی رومانوی تحریک میں انقلاب فرانس کا بھی اہم حصہ ہے۔رومانوی تحریک یوروپ میں عروج وترقی کے منازل طے کرتی رہی اور انگریزی کے زیر اثر اردو زبان وادب میں بھی اس کی شروعات ہوئی اور اس کے اولین نمونے شبلی کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ایک طرح سے اردو زبان وادب میں رومانوی تحریک کو علی گڑھ تحریک کے اصول ونظریات سے متصادم سمجھا جاسکتا ہے۔علی گڑھ تحریک کی عقلیت ،افادیت، اخلاقیت اور مقصدیت،توازن، تکمیل، بیان کے خلاف جن لوگوں نے علم بغاوت بلند کیا اور رومانوی تحریک کے حامی وہم نوا بن گئے ان میں سے بہت سے علی گڑھ سے ہی وابستہ تھے۔ان میں سے رومانوی تحریک کے اہم رکن سجاد حیدر یلدرم بھی ہیں ان کے علاوہ مہدی افادی،عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار کا تعلق علی گڑھ سے رہا ہے ان سبھی نے رومانوی تحریک میں حصہ لیا اور اردو زبان وادب کے عمدہ نمونے

پیش کیے۔ اقبال کی شاعری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر میں بھی رومانوی تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں اختر شیرانی، رومانیت کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ان کی نظموں میں رومانیت کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری بھی رومان سے بھرپور ہے۔ حفیظ، حامد اللہ افسر کے گیتوں ساغر نظامی، روش صدیقی، احسان دانش اور سکندر علی وجد کی نظموں اور اختر انصاری کے قطعات میں بھی رومانیت نظر آتی ہے۔ اردو نثر میں رومانویت یا ادب لطیف کے سلسلے میں عبدالحلیم شرر، ناصر علی، یوسف حسین، انعام اللہ ناصر، عنایت اللہ دہلوی، سلطان حیدر جوش، حجاب امتیاز علی تاج اور آصف علی وغیرہ کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔

رومانوی جذبات انسان کے احساس کا نام ہے اسے عقل کے تابع فرمان اور مطلق اصولوں کے زیر نگیں نہیں رہ سکتے اور کوئی طاقت بھی اسے زیر نہیں کر سکتی ہے جو کلاسیکی پرستی سے سرتابی کرتی ہے۔ رومانوی ادب نے کلاسیکیت کے توازن اور میانہ روی کے برعکس انتہا پسندی اور جذبات کی فراوانی پر زور دیا۔ رومانویت نے ہر جذبہ کو اس کی انتہائی شکل میں پسند کیا۔ رومانویت ہمیں اقبال کی اصطلاح میں ایسی خودی کی یاد دلاتی ہے جو اطاعتِ نفس سے آشنا نہیں ہے۔ اسی لیے رومانویت کا جہان فرد کا جہان ہے، جماعت کی حیثیت یا تو ضمنی ہے یا سرے سے مفقود ہے۔

11.3.3 یورپ میں رومانی تحریک

یوروپ میں رومانیت کی تحریک کا بانی روسو ہے اس کے نظریات اور رومانوی تحریک کو مضبوط کرنے میں کرنی برسی جرمن شاعر ہرڈر کے گیتوں کی بڑی اہمیت ہے، جنھوں نے گیت کے ذریعہ قدرتی حسن کو سادگی معصومیت اور سلاست کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان شعرا کی انھیں خوبیوں نے گوئٹے، برنز، بلیک، کالرج اور ورڈزورتھ کو بھی بہت متاثر کیا اور انھوں نے اپنے گیتوں میں فطری عناصر کو جگہ دی اور ان گیتوں کے زیادہ تر عناصر فطری طور پر ان کی شاعری میں شامل ہو گئے۔ رومانوی تحریک کو فروغ دینے میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شیکسپیئر کی شہرت و مقبولیت نے بھی اہم کردار ادا کیا چونکہ شیکسپیئر کسی جامعہ سے ڈگری یافتہ نہ تھا اس لیے نوجوانوں کو تخلیق ادب کے لیے تعلیمی معیار کو سند ماننے سے انکار کرنے کا جواز فراہم ہو گیا اور ان کا یہ نظریہ ہو گیا کہ پس پردہ ایسی طاقت ہے جو کم تعلیم یافتہ شاعر سے بھی اعلیٰ ادبی تخلیق کر سکتی ہے۔ ناول کی صنف نے یوروپ کی رومانوی تحریک کو ایک نیا موڑ عطا کیا عہد قدیم میں سراڈکلف اور ہورلیس وال پول وغیرہ نے رومانوی ناول کے ذریعہ عوام کی رگوں میں گرم خون دوڑایا تھا۔ بعد کے زمانے میں ریچرڈسن، بلیک، ورڈزورتھ اور کالرج نے رومانوی تحریک کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ یورپ کے رومانی تحریک کا ایک اہم محرک انقلاب فرانس بھی تھا۔ نپولین سے پہلے لوگوں نے عالمی برابری کا جو خواب سجایا تھا فتح و نصرت کے بعد قومی آمریت نے ان کے خواب کو چکنا چور کر دیا۔ حکام تو بدلے مگر جاگیرداری کا نظام اور مستحکم ہوتا چلا گیا۔ انقلاب فرانس کا خواب دیکھنے والوں میں ورڈزورتھ اور شیلے بھی شامل تھے۔ ورڈزورتھ نے اپنے دکھوں کو فطرت کی عکاسی کر کے مٹانے کی کوشش کی۔ مغرب میں رومانیت کی اس تحریک کا پہلا اثر جرمنی میں ہرڈر کے ذریعہ ظاہر ہوا۔ ہرڈر نے اپنے ہم عصر شعرا کو قومی مزاج کے مطابق شاعری کرنے پر اکسایا اسی عہد کا ایک اہم نام جیمس میک فرسن بھی ہے۔ ان شعرا کے علاوہ گوئٹے، شیلر، کانٹ، فشٹے، شیلنگ اور ہیگل وغیرہ اہم نام ہیں۔ انگلستان میں رومانی تحریک کو بلیک، کالرج، ژنگ کی مرہون منت ہے۔ ورڈزورتھ، کیٹس، والٹر سکاٹ، الفریڈ ڈی مسے وغیرہ نے اس تحریک کے ارتقاء میں اہم کارنامہ انجام دیا۔

11.3.4 ہندوستان میں رومانی تحریک

اردو زبان وادب میں محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی کی جامد عقلیت سے بیداری کی جذبات نے رومانوی تحریک کے خدوخال پیدا کیے۔آزاد اور شبلی کے یہ ابتدائی رجحانات رومانوی تحریک کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک غیر شعوری رجحان جس کا اظہار بہت سے ادیبوں کے یہاں ہوتا ہے اردو میں رومانوی تحریک کا پس منظر یوروپ کی طرح کلاسیکیت نہ تھی بلکہ یہاں ایسا ایک انداز فکر تھا جو بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی تحریر میں وتخلیقات کا جزء خاص تھا اور ان کا یہ انداز فکر کسی منظّم کوشش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ انھوں نے مغربی ادبیات سے براہ راست استفادہ کیا تھا اس لیے فطری حسن اور صنف نازک حسن وعشق اور مذہب بیزاری کے موضوعات میں گہری دلچسپی لیتے گئے۔انھوں نے مادیت اور مغربیت پرستی تو علی گڑھ تحریک سے لی مگر اسلوب بیان مقصدیت اور سادگی کی جگہ جدت طرازی اور خوش مزاجی کی راہ ہموار کی اور عقل کی جگہ جذبات کو اپنا رہبر بنایا۔ رومانوی تحریک کو کئی جگہ سے غیر متوقع وسائل سے مدد ملی۔ اس سلسلے میں ٹیگور کی ماورائیت،اقبال کی روایت شکنی، ابوالکلام کی انفرادیت اہمیت کی حامل ہیں۔ رومانوی تحریک کے اردو زبان وادب میں پیدا ہونے کے چند عوامل اور محرکات ہیں۔اس رجحان کو وجود میں لانے والا سب سے بڑا عمل اور محرک غیر ملکی ادبیات کا مطالعہ اور مغربی تہذیب وتمدن سے گہری دلچسپی تھی اس کے علاوہ ان کے مزاج کی رنگینی،نفاست ونزاکت وغیرہ اہم عوامل ومحرکات ہیں۔ رومانوی ادب کے اس رجحان کی بنیادیں آزاد اور شبلی کے مضامین عبدالحلیم شرر، ریاض خیرآبادی اور ناصر علی کے انشائیوں سے فراہم ہوئیں۔ ٹیگور کی مابعد طبیعاتی فکر اقبال کی روایت شکنی اور تصور خودی اور ابوالکلام آزاد کی انانیت اور انفرادیت نے رومانوی تحریک کو ستون فراہم کیے۔ پھر سجاد حیدر یلدرم،مہدی افادی، نیاز احمد،سجاد انصاری وغیرہ نے رومانوی ادب کی عمارت کھڑی کردی اردو زبان وادب میں رومانوی تحریک کو مضبوط کرنے اور عروج وترقی کی اعلیٰ منازل تک پہنچانے میں قاضی عبدالغفار ،جوشی ملیح آبادی، اختر شیرانی، سلطان حیدر جوش، عنایت اللہ دہلوی، حجاب امتیاز علی تاج، حامداللہ افسر، روش صدیقی،ساغر نظامی،احسان دانش،سکندر علی وجد اور آصف علی وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔

اردو نظم میں فطرت اور نیچر سے متعلق نظمیں لکھی گئیں۔اردو نظم میں اقبال کی نظموں اور فکر وفن کے حوالے سے جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں جوش وجذبہ،فکر وعمل اور تیزی وتندی کی کیفیت نے رومانوی شاعروں کو حوصلہ بخشا۔اختر شیرانی رومانوی تحریک کے اوّلین اردو شاعر ہیں،اختر شیرانی نے حسن کی تلاش اور اس کی چاہت میں جذبہ ومستی کا اظہار کیا۔ان کے یہاں ایک خاص کیفیت، چاہت وماورائیت کا عالم ہے جہاں صرف شاعر کا خلوص عشق ومستی ہے،اختر شیرانی کے علاوہ دوسرا اہم نام جوش ملیح آبادی کا ہے۔جوش کی عشقیہ اور انقلابی شاعری دونوں میں حسن وعشق کی اپنی ہی دنیائیں ہیں،ان میں شعرا کے علاوہ حفیظ اور حامد اللہ افسر کے گیتوں،ساغر نظامی، روش صدیقی، احسان دانش اور سکندر علی وجد کی نظموں اور اختر انصاری کے قطعات میں رومانوی اثرات نمایاں ہیں۔

11.3.5 رومانوی تحریک کے اردو زبان وادب پر اثرات

رومانوی تحریک اردو زبان وادب کا ایک ایسا رجحان تھا جو علی گڑھ تحریک کی مغرب پرستی کی راہ سے آیا مگر علی گڑھ تحریک کی عقلیت کے گہرے اثر سے رومانوی تحریک بیزار تھی، اس لیے وہ دوسری انتہا پر پہنچ گئی۔ رومانوی تحریک نے اردو زبان وادب پر گہرے اثرات مرتب کیے چونکہ رومانوی تحریک سے وابستہ ادیب وشاعر مغرب پرست تھے اس لیے انھوں نے انگریزی ادبیات اور مغربی اقدار سے صرف تاثر ہی نہیں لیا بلکہ اس سے مرعوب بھی ہوئے۔ انھوں نے مغرب سے عزت نفس، خودداری اور آزادی کے سبب بھی لئے تھے۔ رومانوی تحریک ایک نئے زمانے کی شروعات تھی اس میں یہ بات ثابت کردی کہ وہ نئی نسل جو سرسید اور حالی کے زیر اثر پروان چڑھی تھی انھوں نے اپنے خواب اور اندیشوں کا برملا اظہار کیا اور سید اور ان کے رفقاء مصلحانہ روش سماجی اصلاح سے غیر اطمینانی ظاہر کی اور ایک نئی راہ نکالی۔ اس رومانوی تحریک نے آزادی اور آسودگی کے تصورات پیش کیے اور ہمارے نئے تعلیم یافتہ طبقے کو خود آگہی کی روشنی دی۔ رومانوی تحریک نے نہ ادب کو حالی سے قبل کی کلاسیکی طرز میں محدود کیا اور نہ ہی حالی اور ان کے رفقا کی طرح کائنات میں گم ہوکر اس کو محض ذریعہ تبلیغ قرار دیا۔ رومانوی تحریک کے نزدیک جذباتی تحریر کی بڑی اہمیت تھی وہ اس تجربہ سے بڑا کام لینے کا ہنر جانتے تھے۔ رومانوی تحریک سے وابستہ ادبا وشعرا نے اہم موضوعات پر تحریریں اور نظمیں لکھیں اور اردو ادب اور شاعری کی بڑی خدمات انجام دیں۔ رومانوی تحریک نے روایت کے تمام تر تصورات کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ قدیم ہیئتوں کو توڑا۔ خوش مذاقی جمالیات اور مذاق سلیم کے ذریعہ نئے اقدار تلاش کیے۔ رومانوی ادیبوں نے جمالیات اور فن کے تقاضوں پر زور دیا اور اخلاص واعتماد کے ساتھ اس بات کا اعادہ کیا کہ فن خود ایک اعلیٰ صنف ہے اور اس کا رستہ سماج کے ساتھ حقیقی ہے۔ رومانیت نے ادب کے رشتے جمالیات سے استوار کیے اس طرح رومانوی تحریک نے اردو زبان وادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

رومانوی تحریک نے اردو شاعری اور اردو نثر اور اردو تنقید سبھی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اردو نظم میں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی وغیرہ کی شاعری خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اردو نثر میں اس رجحان کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا اس میں افسانہ اور ناول بھی شامل ہے۔ اس کے عناصر دبستان بھی تاثراتی تنقید کی دبستان کی عمارت پر بھی اسی انداز فکر سے کھڑی ہوتی۔ اس لحاظ سے رومانوی تحریک ہمہ گیر بھی تھی اور دوررس بھی۔ اس تحریک کو تقویت پہنچانے میں رسائل دل گداز، مخزن، صلائے عام، نگار اور نیرنگ خیال نے اہم حصہ لیا۔ گویا تنقید میں رومانوی اور تاثراتی تنقید میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔

11.3.6 رومانوی تحریک کا زوال

رومانوی تحریک نے جو کارنامے انجام دیے اور جو اقدار دریافت کیں ان میں منفی قدر کا غلبہ ہے اور جو مثبت قدر دریافت بھی کیں وہ مبہم اور منطقی ہیں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ رومانوی تحریک سے وابستہ ادبا وشعرا نے اردو کا ادبی وقار بڑھایا۔ مغربی ادب کی لطافتیں اردو میں منتقل کیں مگر اردو کے اسلوب کو اس قدر جاندار مرصع اور آراستہ وپیراستہ کیا کہ وہی کل کائنات بن گیا اور ان کے ذوقِ جمال نے

ان کے موضوعات کو محدود اور ان کی فکر کو بے جان بنا دیا۔ انھوں نے انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش میں افادیت اور استحکام سے چشم پوشی کی۔ انھوں نے جمالیات سے رشتے استوار کیے اور جمالیات ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور اس بات سے بے خبر رہے کہ فن پارے میں اہم چیز وہ تاثر ہے جو وہ پڑھنے والے پر چھوڑتا ہے۔ احساس محض داخلی چیز ہے اور حسن کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب کہ اس کا سماجی مفہوم بھی ہو۔ رومانوی نقاد انداز بیان کے مزے میں اس قدر محو ہو گئے کہ انھوں نے افکار، خیالات کی حقیقتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ رومانوی تحریک کے زوال میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا کا بھی اہم کردار ہے۔ ترقی پسند ادب کا سارا زور رومانوی بت شکنی اور کلاسیکی ضابطہ پرستی کے خلاف صرف ہوتا رہا۔ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت جس قدر بڑھتی گئی رومانوی تحریک کمزور پڑتی گئی۔ دراصل ترقی پسند تحریک اپنے ابتدائی دور میں رومانوی تحریک سے بغاوت کا مقدمہ تھی۔ منٹو، میراجی، عصمت، راشد اور بہت سے قدیم وجدید لکھنے والا ترقی پسند تحریک کے ہم نوا ہو گئے اس طرح رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک میں گویا ضم ہو گئی مگر ترقی پسند تحریک کے مارکسیت سے ربط وضبط نے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو رومانیت کی طرف مائل کیا اور انھوں نے اپنی تخلیقات میں رومانوی رنگ وآہنگ برتا۔ مخدوم اور علی سردار جعفری کی ترقی پسند شاعری اور انقلابی شاعری کا آہنگ بھی بنیادی طور پر رومانوی ہے۔

رومانوی تحریک میں ایک بڑی کمی یہ تھی کہ ان کے یہاں اسلوب بذاتِ خود مقصد بن گیا اور اس کے موضوعات محدود اور فکر بے جان ہو گئی وہ مغربی قدروں سے مرعوب تھے، رومانوی تحریک میں شاعر اور ادیب اپنی خوش ذوقی ہی کے دائرہ میں محدود ہو گئے۔ احساسات وجذبات کی شدت نے ذہنوں سے حکیمانہ پرکھ کے اجزا کو کھرچ کر زائل کر دیا۔ تصوریت نے حقیقت کے چہرے کو دھندلا کر دیا۔ وہ داخلیت کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ بہت سے لوگ جو سماجی حقیقت نگاری کی راہ سے آگے بڑھ رہے تھے اور اپنے افسانوں سے دلوں کو موہ رہے تھے، رومانوی ادیبوں نے ان کی پذیرائی نہیں کی مگر ترقی پسند تحریک نے ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ترقی پسند تحریک اصل میں اسی تصوریت ورومانویت کا شدید ردعمل تھا جو لندن اور فرانس کے بعد ہندوستان میں آئی اور ایک مستحکم تحریک کی شکل اختیار کر لی اور رومانوی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

11.4 خلاصہ

رومانوی تحریک ایک قدیم تحریک ہے جس نے یورپ میں بھی اہم اثرات مرتب کیے ہین اور انگریزی زبان وادب کے ادبا وشعرا کی تحریروں اور شاعری میں رومانوی تحریک کے عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اردو زبان وادب میں بھی یہ تحریک اہمیت کی حامل رہی ہے۔ محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی کی تقریروں میں اس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، قاضی عبدالغفار، حجاب امتیاز علی وغیرہ ادبا وشعرا نے اس تحریک کو پروان چڑھانے میں حصہ لیا۔ رومانوی تحریک علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت رکھتی ہے اور رومانوی تحریک سے وابستہ بہت سے ادبا وشعرا ترقی پسند تحریک کا حصہ بھی بنے۔

رومانویت صرف حسن وعشق اور تخیلی بیان ہی نہیں بلکہ روایات سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت،

ان دیکھے حسن کی جستجو اور وفورِ جذبات اورغنائیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادیٔ خیال، حسن سے حتی المقدور لطف اٹھانے میں ناآسودگی کا احساس اوراس کے کرب کا نام رومانیت ہے۔رومانوی تحریک کے مختلف ادوار ہیں،مختلف زبان وادب پراس کے نمایاں اثرات ہیں۔یوروپ اورانگریزی زبان اس سے بہت متاثر ہوئی۔اردوزبان میں یہ کلاسیکیت کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی اور اردوشاعری اورنثر پر گہرے اثرات مرتب کیےاور ترقی پسندتحریک کی ابتدااس کے زوال کانقطۂ آغاز تھی۔علی گڑھ تحریک اورترقی پسند تحریک کے درمیان میں یہ تحریک حدفاصل کا درجہ رکھتی ہے۔علی گڑھ تحریک کی عقلیت اور مادیت نے اسے بیزار بنادیا تھا۔ترقی پسند تحریک رومانیت اوراس کی تصوریت وخوابیت کا شدید ردِعمل تھی۔

11.5 نمونے کے امتحانی سوالات

1. رومانوی تحریک کا تعارف پیش کیجیے۔
2. رومانوی تحریک کے آغاز کس طرح ہوا؟ واضح کیجیے۔
3. رومانوی ادیبوں پر مفصل نوٹ لکھیے۔
5. رومانوی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
6. رومانوی تحریک نے اردوادب پر کیا اثرات مرتب کیے،اس کا جائزہ لیجیے۔

11.6 فہرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
انانیت	خودی،خودبینی،مطلق العنانی	نصرت	فتح،جیت،یاری،مدد،پرچک
تخیل	خیال	آمریت	ڈکٹیٹرشپ،مطلق العنان،فرماں روا کی حکومت
مظہر	بیان کرنے والا،گواہ،شاہد	جامد،	جماہوا،ٹھوس،بےحس،مردہ
استحکام	پختگی،مضبوطی،استواری	لغزشوں	پھسلن،رپٹن،لرزش،ٹھوکر

11.7 شفارش کردہ کتابیں

انورسدید — اردوادب کی تحریکیں
پروفیسرمحمدحسن — اردوادب میں رومانوی تحریک
ڈاکٹرمنظراعظمی، — اردوادب کے ارتقامیں ادبی تحریکوں اوررجحانوں کا حصہ
اعجازحسین — تاریخ ادب اردو

اکائی ۱۲ : ترقی پسند تحریک

اکائی کے اجزاء

12.1 مقاصد

12.2 تمہید

12.3 موضوعات

12.3.1 یورپ اور ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا تاریخی پس منظر

12.3.2 ترقی پسند تحریک کا آغاز

12.3.2 ایشائی ادیبوں کی یورپ میں کانفرنس

12.3.3 ادب اور سماج کا نظریہ

12.3.4 ادب برائے زندگی کا نظریہ

12.3.5 اردو نثر پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

12.3.6 اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

12.4 خلاصہ

12.5 نمونے کے امتحانی سوالات

12.6 فہرہنگ

12.7 شفارش کردہ کتابیں

12.1 مقاصد-

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ۔۔۔

☆ یوروپ اور ہندوستان کے تاریخی پس منظر سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ یوروپ میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا جائزہ لے سکیں گے

☆ شاعری اور نثر نگاری پر ادب برائے زندگی کا اثر کس طرح مرتب ہوئے اس سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ ترقی پسند تحریک کا پس منظر اور اس کے نظریات سے واقف ہوسکیں گے۔

12.2 تمہید

ادبی تخلیقات مختلف زمانوں میں مختلف تحریکات ورجحانات سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔اردو کی اہم ادبی تحریکات سرسید تحریک ،رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ ہیں۔کسی تحریک کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ اس تحریک کا پس منظر کیا تھا۔بغیر سیاسی سماجی اور تہذیبی پس منظر جانے تحریک کو سمجھنا ناممکن ہوتا ہے۔اس لیے ترقی پسند تحریک کے مطالعے سے پہلے یوروپ اور ہندوستان کا تاریخی پس منظر سمجھنا بہت ضروری ہے۔ہندوستان میں سیاسی سماجی اور قومی بیداری کا آغاز انیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ اس دور میں مذہبی اصلاحی تحریکیں باقاعدہ طور پر وجود میں آئیں۔جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے طور پر معاشرے کی اصلاح کا کام شروع کیا۔غدر کے بعد انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہوگئے۔انگریزی اقتدار کے تسلط اور معاشی وتہذیبی استحصال کے باوجود انگریزوں نے کچھ کام ایسے کیے جن کا نتیجہ ہندوستانیوں کے لیے مفید ثابت ہوا۔ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں نئے طرز کی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔انگریزی نظامِ تعلیم کی ترویج سے ہندوستانیوں کے فکر ونظر کے دروازے کھلنے لگے، ہندوستانی دنیا کے حالات وواقعات سے آشنا ہوکر جمہوریت، انسانی مساوات اور آزادی کی اہمیت سمجھنے لگے۔انقلاب روس اور مزدوروں کی حکومت نے ہندوستان کو اشتراکیت اور رکمیونزم کے نزدیک لادیا۔کانگریس کے اندر بھی جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس وغیرہ اشتراکیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔پوری دنیا کے ادیب وشاعر اشتراکیت کے اثرات قبول کررہے تھے۔اسی دوران فاشزم کے بھیانک طوفان کی زد سے ادب اور تہذیب کو محفوظ رکھنے کی غرض سے دنیا بھر کے اشتراکی مصنّفین نے متحد ہوکر جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔

12.3 موضوعات

12.3.1 یورپ اور ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا تاریخی پس منظر

ہندوستان میں سیاسی سماجی اور قومی بیداری کا آغاز انیسویں صدی کے شروع میں ہو چکا تھا۔اس سلسلے میں عوامی ذہنی بیداری کے لیے مذہبی تحریکات پیش رفت کر چکی تھیں۔ان مذہبی تحریکات نے مسلسل کوششوں کے بعد عوام کی ذہنی وفکری سطح کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ وہ آزادی کا مفہوم سمجھنے لگے تھے، اور اس کی اہمیت سے واقف ہو چکے تھے۔ہندوستان میں یہ جذبہ انگریزوں کی سازشوں کے خلاف ایک ذہنی ردعمل کے طور پر ابھرا تھا کیونکہ سارے ملک میں عیسائی مشنریاں مذہب کی ترویج واشاعت کے لیے سرگرم تھیں۔ملک کے گوشے گوشے میں ان کے مراکز قائم ہو چکے تھے۔تبدیلیٔ مذہب کو اپنا نصب العین بنائے عوام کو اپنے مذہب کی طرف متوجہ کررہی تھیں۔عیش ونشاط کی سہولتیں، سماج میں باعزت مقام اور اعلیٰ عہدوں کا لالچ دے کر انھیں اپنے مقصد میں بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل ہورہی تھی۔

عیسائی مذہب کی تبلیغ حکومت کی سرپرستی میں تمام سرکاری ذرائع ابلاغ سے ہورہی تھی۔لوگ دین سے زیادہ دنیوی فلاح کی طلب میں اس نئے مذہب کو اپنا رہے تھے۔اس عمل سے باشعور طبقہ فکرمند ہوا اور تبدیلیٔ مذہب کو ایک سنگین خطرہ قرار دے کر لوگوں کو

اس سے باز رکھنے کے لئے اپنی تہذیب کی عظمت، اقدار کی بلندی اور مذہب کی اہمیت سے روشناس کرانے کا ایک مربوط منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مذہب میں درآئی فرسودہ رسم ورواج سے لوگوں کو آگاہ کر کے مذہب کی صحیح روح کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس لیے اس دور میں مذہبی اصلاحی تحریکیں باقاعدہ طور پر وجود میں آئیں۔ جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے طور پر معاشرے کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ ہندوؤں میں اصلاحی نقطۂ نظر سے جو تنظیمیں وجود میں آئیں ان میں برہموسماج، پراتھنا سماج، آریہ سماج اور رام کرشن مشن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، وہابی تحریک، فراضی تحریک اور سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اس سلسلے میں بارآور ثابت ہوئیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے نظریے کے مطابق، انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے کچھ کام ایسے کیے جن کا نتیجہ ہندوستانیوں کے لیے مفید ثابت ہوا جیسے نئی تعلیم کا رواج ستی اور دختر کشی کی رسموں کا انسداد، اخباروں کو آزادی دینا اور ملک میں صنعت و حرفت کی ترویج وغیرہ۔ ان سے ہندوستان کے بدلتے ہوئے ذہن نے قومیت کے جدید تصور کی تشکیل کر لی اور بیرونی اقتدار کے تسلط اور معاشی وتہذیبی استحصال کا احساس عام ہونے لگا تھا۔

۱۸۵۷ء کا غدر ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور نفسیاتی زندگی میں ایک زبردست انقلاب کا آغاز کیا، اور ہندوستان عہد وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکل کر بیداری اور روشنی کے جدید دور میں داخل ہوا۔ غدر کے بعد انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو گئے۔ غدر کے پہلے ہندوستانی زندگی نے مغربی اثرات دھیرے دھیرے قبول کیے تھے لیکن غدر کے بعد ان کی معاشرت اور تہذیب کا اثر براہ راست پڑنے لگا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں نئے طرز کی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں، تار، ڈاک، ریل موٹر اور مغربی ممالک کی سائنسی ایجادوں سے ہندوستانی زندگی پہلے ہی آشنا ہو چکی تھی۔ جن سے فاصلے کم ہونے لگے، صنعتی کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے گھریلو دستکاریوں کے لیے میدان تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔

انگریزی نظامِ تعلیم کی ترویج سے ہندوستانیوں کے فکر ونظر کے دروازے کھل گئے، وہ دنیا کے حالات و واقعات سے آشنا ہونے لگے۔ جمہوریت، انسانی مساوات اور آزادی کے جذبات ان کے دلوں میں موجیں مارنے لگے۔ ہندوؤں میں اصلاحی تحریکات جاری وساری تھیں اور لوگ ذہنی بلوغ کی طرف گامزن تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے انگریزی حکّام کی نگاہ میں مسلمانوں سے بہتر ہو گئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے گئے لیکن مسلمان غلط تعلیم وتربیت، گمراہ کن تہذیبی تصورات اور کم علمی کی وجہ سے نئے زمانے کی طرف سے منہ موڑے بیٹھے تھے۔ کیونکہ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ انگریزوں کا سلوک اور ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ بالعموم حکومتِ برطانیہ سے ان کی شدید نفرت کا سبب تھا۔ اور اس نفرت نے انھیں ہر نئی چیز سے جس کا تعلق مغرب سے ہو متنفر کر دیا تھا۔ لوگ لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے اور سماجی سیاسی اور عملی زندگی کی نئی تبدیلیوں سے چشم پوشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس موقع پر سرسید احمد خاں منظر عام پر ابھرے، جو ایک بیدار مغز روشن خیال اور باشعور انسان تھے، ان کو حالات کی تبدیلی کا گہرا شعور تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی پسماندگی اور خستہ حالی کا واحد سبب ان میں تعلیم کی کمی ہے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو دوسروں کے مساوی لانے کے لیے ان میں حوصلہ پیدا کیا اور احساس کمتری سے باہر نکالا۔ انگریزوں اور مسلمانوں کے بیچ ایک پل کا کام کرتے ہوئے

دونوں کی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ سائنسی نظریے کو عام کرنے کے لئے ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ۱۸۷۵ء میں علیگڑھ میں ''محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج'' کی بنیاد ڈالی۔ حالانکہ ان اصلاحی تحریکات میں مذہب کا عنصر غالب تھا لیکن ان افکار اور سماجی بیداری نے عوام کے ذہنوں کو جلا بخشی اور وہ آہستہ آہستہ گمراہ کن اور تباہ کن رسم ورواج کی قید سے آزاد ہو کر ایسے ادارے اور جماعتیں بنانے لگے جن کا نصب العین سیاسی جدوجہد تھا۔ اس کے نتیجے میں کلکتہ لینڈ ہولڈر سوسائٹی، بمبئی ایسوسی ایشن، مدراس نیٹو ایسوسی ایشن، بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی، اور برٹش انڈیا ایسوسی ایشن جیسی تنظیمیں وجود میں آئیں۔

سارے ملک میں جو ترقی پسند عناصر ارتقائی منازل طے کر رہے تھے۔ ان کا یکجا ہو جانا لازمی اور فطری تھا، اس لیے اس دھارے کو انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لینا زیادہ قرین مصلحت سمجھا۔ اس غرض سے گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کے ایما پر لارڈ اے.او.ہیوم کی مدد سے بمبئی میں ۲۸/دسمبر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی داغ بیل پڑی۔ ابتداء میں اس نئی تنظیم کا مقصد محض حکومت برطانیہ کے مفادات کا تحفظ تھا۔ کانگریس کی تشکیل سے انگریزوں کو تحریک آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے انتشار، تشدد اور بدامنی پر قابو پانے میں کافی حد تک کامیابی ملی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ آخر کار کانگریس کی جدوجہد ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے مل کر لڑی تھی۔ جس کی بنا پر انگریزوں کو یقین کامل ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو ہندو مسلمان دونوں کے بیچ نفاق پیدا کرنا لازمی ہوگا۔ اس نظریے کے تحت ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کا ردِعمل یہ ہوا کہ ۱۹۰۶ء کے کانگریس اجلاس میں دادا بھائی نوروجی نے پہلی بار سوراج حاصل کرنے کے تصور کو واضح کیا۔ سودیشی تحریک کو حکومت نے بری طرح پسپا کر دیا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداء میں مسلم لیگ میں اعلیٰ طبقے کے مسلمان اور زمیندار شامل ہوئے۔ لیکن جلد ہی یہ بھی کانگریس کی طرح انگریزوں کے خلاف قومی تحریک میں حصّہ لینے لگی۔ اور ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے بھی سوراج حاصل کرنا اپنا مقصد بنایا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے بیچ لکھنؤ معاہدہ ہوا، جس میں جداگانہ انتخاب کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور یہ اعلان کیا کہ دونوں پارٹیوں کا مقصد ہندوستان کو ڈومینین (Dominion) کا درجہ دلانا ہے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک دونوں پارٹیوں میں خوشگوار تعلقات قائم رہے، لیکن ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ معاہدہ مسترد کر دیا گیا اور دونوں پارٹیوں میں اختلاف شروع ہو گیا، اس کے پیش نظر مسلم لیگ نے کانگریس کی عدم اعتماد کی تحریک، سائمن کمیشن کی تجویز کی مخالفت کی۔

جون ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں برطانیہ نے ہندوستان کو بھی شامل کر لیا۔ ان دنوں کانگریس کی قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے انھوں نے جنگ میں برطانیہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ قائم ہوئی۔ جنگ کے اثرات سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوا اور ضروریات زندگی کی اشیا گراں سے گراں تر ہو گئیں۔ اس وقت کے ادب پر ان تحریکوں کا گہرا اثر پڑا۔ اسی زمانے میں رولٹ ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس وقت تک گاندھی جی عملی سیاست میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکے تھے۔ انھوں نے اس قانون کو رد کرنے کے لیے پُر امن طریقہ سے ستیہ گرہ کا اعلان کیا۔ اسی سلسلے میں ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیان والا باغ میں ہزاروں مرد، عورت، بوڑھے بچے رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے کے لئے جمع ہوئے۔ جن پر گولیوں کی

بوچھار کر دی گئی اور تقریباً ایک ہزار لوگ مارے گئے ۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک، گاندھی جی کے عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک سے مل کر ہندوستان کی تحریک آزادی کا حصّہ بن گئی۔ جس سے ہندو مسلم اتحاد قائم ہو گیا ۱۹۲۰ء میں ہی ٹریڈ یونین کانگریس قائم ہوئی اور چھ مہینوں میں تقریباً دو سو ہڑتالیں ہوئیں جن میں پندرہ لاکھ مزدوروں نے حصّہ لیا۔

۱۹۲۱ء میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کی قرارداد پیش کی جو گاندھی کی سخت مخالفت کی وجہ سے پاس نہ ہو سکی۔ اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ جب تک گورنمنٹ پنجاب میں مظالم اور زیادتی کی تلافی نہ کرے اور سوراج قیام عمل میں نہ آئے تب تک شدت کے ساتھ پُر امن ترک موالات کی تحریک جاری رہے گی۔ اسی دوران گورکھ پور میں چوراچوری کا حادثہ ہوا جس میں تقریباً تین ہزار کسانوں کے جلوس پر گولی چلادی گئی، مجمع نے تھانے میں آگ لگادی جس میں ۲۲ سپاہی جل کر مر گئے۔ گاندھی جی نے موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے کی مرضی کے خلاف ستیہ گرہ روک دیا۔ عوام کا جذبہ جوش اور حوصلہ منتشر ہو گیا۔ موتی لال نہرو اور دیش بندھو نے کانگریس سے الگ ہو کر سوراج پارٹی بنائی ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراج پارٹی کو خوب کامیابی ملی، کانگریس نے سوراج پارٹی کے پروگراموں کو اپنا لیا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک ملک پر سیاسی انجماد طاری رہا۔ لیکن فرقہ پرستی کو فروغ ملا۔ ہندمہاسبھا اور مسلم لیگ میدان میں اُتر آئیں۔ سوراج پارٹی بھی فرقہ پرستی کا شکار ہو گئی۔ گاندھی جی نے ان فسادات کے خلاف مولانا محمد علی کے مکان پر ۲۱ دن کا برت رکھا۔ لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا ۱۹۱۷ء میں روس میں زبردست انقلاب آچکا تھا اور مزدوروں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس کے اثرات پوری دنیا نے قبول کیے۔ ہندوستانی سیاست پر بھی اس کے اثرات پڑے اور کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی۔ کانگریس کے اندر بھی جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس اشتراکیت سے متاثر ہوئے۔

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن آیا۔ جس کے سارے ممبر انگریز تھے۔ ہندوستانیوں کو اس سے الگ رکھا گیا۔ اس لیے پورے ملک میں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے جس کے نتیجہ میں کلکتہ اور مدراس میں مظاہرین پر گولیاں چلائی گئیں۔ لاہور میں لالہ لاجپت رائے کی لاٹھیوں سے موت ہو گئی۔

پنڈت موتی لال نہرو نے ۲۹ سیاسی پارٹیوں کے اجلاس کی قیادت کرتے ہوئے ایک سب کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جسے نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے، ہندوستان کے لیے ڈومینین کا مطالبہ کیا گیا۔ نہرو رپورٹ کے بعض نکات پر مسلم لیگ کو اعتراض تھا۔ محمد علی جناح نے ۱۴ نکاتی تجویز پیش کی جسے نامنظور کر دیا گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے الگ ملک بنانے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اس طرح قومی تحریک دو دھاروں میں بٹ گئی۔

۱۹۲۹ء میں جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر اور سبھاش چندر بوس سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں بائیں بازو کا غلبہ تھا اور گاندھی شریک نہیں تھے اس لیے کانگریس نے مکمل آزادی حاصل کرنا اپنا نصب العین قرار دیا۔ گاندھی جی نے جس کی مذمت کی۔ اس اجلاس سے سوراج کا مفہوم مکمل آزادی میں تبدیل ہو گیا اور ہندوستانی سیاست میں مساوات اور سوشلزم کی گونج سنائی دینے لگی۔ ۲۶ رجنوری ۱۹۳۰ء کو پہلا یومِ آزادی منایا گیا۔

۱۹۳۰ء میں دوسری سوِل نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔گاندھی نے ڈانڈی یاترا کی اور نمک قانون توڑا۔یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔لاکھوں لوگوں نے ستیہ گرہ اور بدیسی سامان کے بائیکاٹ میں حصہ لیا۔کسانوں نے لگان کی ادائیگی بند کردی۔سخت مخالفت کے باوجود بھی لاہور میں ۲۳/مارچ کو بھگت سنگھ راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی دے دی گئی۔

مئی ۱۹۳۰ء کو کانگریس غیر قانونی پارٹی قرار دے دی گئی۔گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے ساتھ تمام سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا جس کے خلاف ملک گیر پیمانے پر مظاہرے ہوئے۔حکومت کی سختی سے عوام کے جوش وخروش میں مزید اضافہ ہوا۔

کانگریس کے کراچی اجلاس میں کانگریس نے جمہوری طریقے سے اپنی راہِ عمل طے کرنے کا اعلان کیا جس میں سوشلسٹ رجحانات کا عکس تھا۔کمیونسٹ پارٹی سارے ہندوستان میں روز بروز مقبولیت حاصل کرتی جارہی تھی۔۱۹۳۴ء میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی قائم ہوئی جس کی بنیاد جے پرکاش نرائن اور آچاریہ نریندر دیو نے رکھی۔اس وقت کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ساتویں کانگریس کی قراردادوں کے مطابق تمام ملک میں ایک سماج دشمن محاذ تیار ہورہا تھا۔

اس وقت تک جو ترقی پسند خیالات سامنے آرہے تھے ان کی بنیاد ایک اہم اور نتیجہ خیز تاریخی واقعہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب تھا۔روسی انقلاب دراصل مارکسی جدلیاتی مادیت کے نظریے کا ایک عملی مظہر اور اشتراکیت کی تفسیر تھا،جس نے جدید ذہن اور شعر وادب کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا۔اور ساتھ ہی ساتھ سماجی ارتقاء،تہذیب،فلسفہ اور سائنس کا رخ موڑ دیا۔

ہیگل کے فلسفہ وفکر کی بنیاد جدلیاتی نظام پر قائم ہے،جس کے مطابق مادی حقیقت جامد اور ساکن نہیں بلکہ متحرک اور ارتقا پذیر ہے اور اپنی پہلی شکل کو ترک کرکے نئی شکل اختیار کرتی ہے۔اس کا خیال ہے کہ حقیقت اور شعور دو بنیادی حقیقتیں ہیں اور دونوں کے درمیان عمل اور ردعمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ہیگل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعور کو حقیقت سے قدیم اور فائز مانتا ہے،یہی اس کی تصوریت بھی کہلاتی ہے۔

مارکس نے ہیگل کی جدلیت کو تصوریت سے بالکل الگ رکھا،اور حقیقت کو ہی ازلی اور ابدی حیثیت کا حامل قرار دیا،مارکس بھی حقیقت کو حرکت دوام کا پابند سمجھتا ہے،جو علت ومعلول (Cause & effect) کے باہمی عمل سے نئی نئی شکلیں اختیار کرلیتی ہے۔مارکس کے نظریے کی رو سے اصل حقیقت مادّہ ہے،جو شعور کو جنم دیتا ہے،لیکن شعور الگ وجود رکھتا ہے۔اور اس قابل ہے کہ مادّی قوتوں پر اثر انداز ہوسکے اور خارجی حقیقتوں کی نئی تخلیق کرسکے۔مارکس کا خیال ہے کہ ہیگل نے جدلیاتی مادیت میں مادہ کو ثانوی اہمیت دے کر اسے سر کے بل کھڑا کردیا تھا،جسے خود مارکس نے مادہ کو بنیادی حقیقت تسلیم کرکے پیروں پر کھڑا کیا اور سماجی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے ٹھوس بنیادیں مہیا کیں۔مارکس کے خیال سے سماج عہد بہ عہد نئے تضادات اور امتیازات کا شکار ہوتا ہے اور طبقوں کی کشمکش جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پرانا نظام ختم ہوکر نیا نظام عمل میں آتا ہے۔اسی طرح قبائلی نظام سے سامنتی نظام،سامنتی نظام سے سرمایہ داری کا نظام وجود میں آیا،اور پھر سرمایہ داری کے خلاف اشتراکی نظام سرگرم عمل ہوا۔مارکسی سماجی انقلاب اور سماجی ارتقا کے لیے اقتصادی نظام کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔پیداوار کے ذرائع کی غلط تقسیم نے طبقاتی نظام کو جنم دیا اور محنت وزر کی کشاکشی کا آغاز ہوا جس میں محنت کی قوتیں اہل زر کو ان کے عقائد روایات اور قدروں کے ساتھ شکست دیتی رہیں اور نئے دور میں نیا نظام وجود میں آیا۔

اشتراکی نظریات روسی ادیبوں کے ذہن کا جز بن گئے اور روس کی سرحدوں کو پھاند کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔انقلاب روس اور جنگ عظیم کے تباہی خیز نتائج کا مشاہدہ کرنے کے بعد کچھ انگریز شعراء اور ادباء اشتراکی نظریے کے زبردست مبلغ بن گئے۔ ہندوستان بھی اشتراکی خیالات سے پوری شدت سے متاثر ہوا۔ یہاں کے سیاسی حالات نے اشتراکی تحریک کے لیے میدان ہموار کیا، یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء میں کانپور میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس ہوئی، اور ہندوستان کی سرزمین پر اشتراکی نظریہ کی اشاعت کے لیے اجتماعی کوششیں شروع ہوئیں۔اردو شعروادب میں اشتراکی خیالات واضح طور پر ان تمام قلمکاروں کی تحریروں میں جو ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام کے بعد اس ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے تھے ابھرنا شروع ہوئے۔

12.3.2 ترقی پسند تحریک کا آغاز

سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش محمد دین تاثیر اور پرمود سین گپتا بھی لندن میں مقیم تھے۔جو لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے۔سجاد ظہیر کے مطابق ایسی عجیب وغریب صورتِ حال کے ردعمل سے محفوظ ہوتا۔ یورپ میں مقیم ہم ہندوستانی طالب علموں کے لیے ناممکن تھا۔ ہماری رگوں میں گرم خون گردش کر رہا تھا اور ہم لوگ اپنے مقاصد کی تلاش میں صحیح راہِ عمل کے متلاشی تھے۔

یورپ کے ترقی پسند ادیبوں کی سرگرمیوں سے متاثر نوجوانوں کو مقاصد کی یکسانیت نے ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا۔اور ۱۹۳۵ء میں ان کے ذریعے ایک ادبی انجمن کی تشکیل وتعمیر میں بھی مدد ملی۔ چنانچہ ''انڈین پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن'' کا قیام عمل میں آ گیا۔ پھر انجمن کے مقاصد کا اعلان نامہ تیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ملک راج آنند کا مسودہ طوالت کی وجہ سے رد کر دیا گیا۔ دوسرا مسودہ ڈاکٹر جیوتی گھوش نے تیار کیا، اس کے بعد کمیٹی کے فیصلے سے سجاد ظہیر نے دونوں مسودوں میں مناسب ترمیم و تنسیخ کے بعد ایک نیا مسودہ تیار کیا۔ مسودہ تیار ہونے کے بعد لندن میں نان کنگ ریستوراں میں انجمن کی پہلی باقاعدہ میٹنگ ہوئی، جس میں تمام تر کوششوں کے بعد ۳۰-۳۵ ہندوستانی طلبا شریک ہوئے اور اتفاق رائے سے ملک راج آنند کو انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ پھر اعلان نامے کا اجرا عمل میں آیا۔اعلان نامے پر اولین دستخط کرنے والوں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر، ایس سنہا اور کے.ایس. بھٹ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد انجمن کے جلسے باقاعدگی سے ہونے لگے۔

12.3.3 ایشائی ادیبوں کی یورپ میں کانفرنس

یورپ کے اقتصادی بحران، جرمن کی نازی حکومت کی تاناشاہی اور فاشزم کے بھیانک طوفان کی زد سے ادب اور تہذیب کو محفوظ رکھنے کی غرض سے دنیا بھر کے اشتراکی مصنّفین نے متحد ہو کر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آنے کی ضرورت محسوس کیا۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہ اپنے آپ میں نہایت اہمیت اور جرأت کی بات تھی کہ مصنّفین کی اتنی بڑی تعداد نے متحد ہو کر فاشزم کے خلاف آواز بلند کی۔ دنیا کے کونے کونے سے دانشوروں نے اس کانفرنس میں حصّہ لیا۔ ہندوستان سے صرف ایک پارسی قلم کار خاتون صوفیہ واڈیا نے اس میں شرکت کی۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی لیکن ان کی

حیثیت صرف سامعین جیسی تھی۔ انھوں نے مختلف لوگوں کے خیالات سُن کر ان خیالات کو ہندوستانی ماحول اور موجودہ سیاسی تناظر میں رکھ کر تجزیہ کیا۔

12.3.3 ادب اور سماج کا نظریہ

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے مباحث خاصے قدیم اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ان بحثوں سے دبستانوں کے عروج وزوال کی کہانی وابستہ ہے۔ادب کا ایک مکتبہ فکر ادب کو نیم شعوری وغیر شعوری زندگی کا ترجمان کہتا ہے۔ یہ نظریہ فرائڈ کے تحلیل نفسی (شعور، لاشعور اور تحت شعور) کے فلسفے سے نکلا ہے۔اس نظریے کے مطابق ادیب وشاعر اجتماعی حیثیت کے بجائے صرف انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔جبکہ دوسرا مکتبہ فکر ادب کو سماج کی پیداوار مانتا ہے۔بعض لوگ ادب کو ذہنی تعیش کہتے ہیں، جبکہ اس کا مخالف نظریہ ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیتا ہے۔ادب تاریخ، فلسفہ یا سائنس نہ ہوکر ادب ہوتا ہے۔ادب روح یا خدا کی طرح کوئی غیر فطری طاقت پیدا نہیں کرتی ہے۔ادیب اور شاعر انسان ہوتے ہیں جو اپنی زندگی سماج میں یعنی اس دنیا میں بسر کرنے کے لیے سماجی تعلقات قایم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔سماج سے ماورا اور مجرد کسی انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔انسان درحقیقت اسی وقت انسان ہو سکتا ہے جب تک وہ ایک انسانی جماعت یا سماج کا فرد ہوتا ہے۔ ادب اپنے زمانے کی پیداوار اور اپنے سماج کے ماحول کا آئینہ کہلاتا ہے۔فنکار اپنی تخلیقات میں صرف قلبی واردات ہی نہیں پیش کرتا ہے بلکہ اسے اپنے آس پاس جو کچھ نظر آتا ہے، وہ اسے تخلیقات میں جذب کر لیتا ہے۔قاری جب ان تخلیقات کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنے تجربات کا عکس نظر آتا ہے۔ادیب کے خیالات اور شعور کا ارتقا اس کے معاشی وسماجی اور تہذیبی نظام کے مطابق ہوتا ہے اور ادب کے تخلیقی کارنامے اس کا عکس ہوتے ہیں۔اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب سماجی زندگی کا ترجمان، عکاس اور آئینہ دار ہوتا ہے۔

12.3.4 ادب برائے زندگی کا نظریہ

ادب کو کسی فلسفے یا نظریے کا غلام بنا دینا اس کی ادبیت، افادیت اور وسعت کو مجروح کرنا ہے، اس لیے ادب کو زندگی کی حقیقتوں کے آئینے میں ہی دیکھا جانا چاہیے۔ادب دراصل زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔وہ خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کرتا ہے۔ادب انسانی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات واحساسات کے علاوہ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔اس میں تاریخی حقیقت زندگی کا سچا تصور اور فن کے صحیح احساس کا ہونا ضروری ہے۔اگر ہم تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو ادب سے شعوری فائدہ اٹھانے کا خیال مارکس کے فلسفیانہ نظریات سے نکلا ہے۔اس لیے ادب صرف یہی نہیں کہ ہماری فکری وذہنی سطح کو بلند کرے بلکہ بدلتے ہوئے سماجی نظام میں بھی معاون ومددگار ثابت ہونا چاہیے۔

ادب زندگی کا ترجمان اور تنقید حیات ہے، اس لیے بہترین ادب میں سماجی، ثقافتی، فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کا ہونا لازمی ہے کیوں کہ یہی چیزیں اس کو زندگی سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ ادب انسان کے خیالات وجذبات کے اظہار کا نام ہے اور اس کے خیالات اور جذبات کی بنیاد تجربات پر ہوتی ہے۔ یہ تجربات زندگی اور اس کے مادی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔، جن حالات سے اس کی زندگی

دوچار ہوتی ہے اس کے نقوش خیالات کے ذریعے ادب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ادب ساکن و جامد تصورات کا اظہار نہیں ہے بلکہ وہ لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے معاشرتی نظام، تہذیبی اقدار اور سماج کے ارتقا کا ایک جزو ہے۔

انسان کی مادی زندگی کے نشیب و فراز سے فنی مظاہر بھی تعلق رکھتے ہیں اور انسان کے خیالات اور شعور کا ارتقا اس کے معاشی و سماجی نظام اور تہذیبی انقلابات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کا مادی وجود ہی اس کے شعور کا تعین کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن حقیقتوں کو نہیں بلکہ مادی حقائق ذہن کو جنم دیتے ہیں اور انسانی ذہن سے باہر ان کا ایک مادی وجود ہوتا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں جو سماج میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے ادب کو سماجی زندگی کا ترجمان، کشمکش حیات کا مظہر اور زندگی کا آئینہ کہا گیا ہے۔

12.3.5 اردو نثر پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

سرسید احمد خاں نے سب سے پہلے زندگی اور ادب کے گہرے تعلق کے نظریے کو پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ادب صرف تفنن طبع کی چیز نہیں ہے بلکہ عین حیات ہے۔ اس میں زندگی کی حقیقتیں اس طرح بیان ہوں جس سے سماج فائدہ حاصل کر سکے۔ اس طرح سرسید نے شعر و ادب کے افادی پہلو پر زور دیتے ہوئے اردو میں مقصدی شعر و ادب کے تخلیق کی روایت قائم کی۔ سرسید تحریک سے متاثر شعرا میں حالی کو اولیت حاصل ہے۔ وہ نظم جدید کی تحریک میں آزاد کے ہمنوا رہ چکے تھے۔ لہٰذا سرسید تحریک کے فعال رکن کی حیثیت سے ان خیالات کی تشہیر کرنے لگے۔ مقدمہ شعر و شاعری بنیادی طور پر سرسید تحریک کے اصول و نظریات کی تشریح و تفسیر ہے۔

نثری اصناف میں ادب برائے زندگی کے نظریے کا عمل دخل سرسید تحریک سے شروع ہوتا ہے۔ سرسید کے مضامین، مقالات اور انشائیے وغیرہ اصلاحی نظریے کے حامل ہیں۔ سرسید کی تحریروں نے جہاں ان کے خیالات اور تحریک کو آگے بڑھایا وہیں اردو نثر کے معیار اور وقار کو بھی بلند کیا۔

سرسید کے دوسرے ساتھیوں میں محسن الملک، چراغ علی اور وقار الملک نے تعلیمی اور تہذیبی مضامین لکھ کر سرسید کے خیالات کی تشہیر کی۔ عبدالحلیم شرر، وحید الدین سلیم اور مولوی عزیز مرزا وغیرہ نے بھی بہت سے مضامین لکھے۔ حالی نے ادبی سوانح عمریاں لکھیں۔ نذیر احمد نے اصلاحی ناول لکھے۔ انھوں نے اردو ناول کی بنیاد رکھتے ہوئے زندگی کی سچی تصویر کشی کی۔ شرر کے تاریخی ناولوں میں مذہبی جوش اور مقصدیت ہے۔ سرشار کے ناولوں میں بھی کم و بیش وہی محرکات موجزن ہیں جو سرسید تحریک کی پہچان تھے۔ محمد علی طبیب، مرزا محمد سعید اور مرزا محمد ہادی رسوا وغیرہ نے سرشار اور شرر کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان سبھی ادیبوں کے یہاں زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ جوالا پرشاد برق، مرزا عباس حسین ہوش، سجاد حسین کسمنڈوی، سید محمد آزاد محمد احسان اللہ العباسی، علامہ راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش وغیرہ نے نذیر احمد، سرشار اور شرر کی روایتوں کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی تخلیقات میں تہذیب و معاشرت اور تعلیم و تربیت کو موضوع بنایا۔ یہ دور اصلاحی دور کہلاتا ہے، لیکن ان تمام فن پاروں میں ہمیں اس دور کی زندگی سانس لیتی نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مختصر افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔ منشی پریم چند نے قومی بیداری اور حب وطن کو موضوع بناتے ہوئے افسانے کی داغ بیل رکھی۔ سجاد حیدر یلدرم نے شرر کی روایت کو ایک مستقل حیثیت دیتے ہوئے ترکی معاشرت اور ترکی ادب سے متاثر

ہوکر رومانیت میں ڈوبے ہوئے افسانے تخلیق کیے۔مہدی افادی، نیاز فتح پوری اورل احمد اکبرآبادی وغیرہ کی تحریروں میں عشق ورومان کا جذبہ نمایاں ہے۔رومانیت کے دوش بدوش اصلاحی ،تصوراتی ،عینیت پرستانہ اور پھر حقیقت پسندانہ افسانوی ادب تخلیق کیا گیا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک یہی رجحانات اردو نثر پر چھائے رہے۔انگارے کی اشاعت اردو کے افسانوی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔انگارے کے افسانوں میں جو بے باکی اور بے لگامی ہے وہ ترقی پسند افسانوں میں بھی منٹو اور عصمت کے یہاں نظر آتی ہے۔پریم چند کے آخری دور کے افسانے حقیقت نگاری کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں۔حقیقت نگاری کے تحت لکھے گئے تمام افسانوی ادب میں زندگی اور سماج کی جیتی جاگتی تصویریں موجود ہیں۔لہٰذا سرسید تحریک سے لے کر ترقی پسند تحریک کے قبل تک کے نثری ادب پر ایک ارتقائی شکل میں حاوی رجحان کے طور پر ادب برائے زندگی کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

12.3.6 اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

شاعری پر ادب برائے زندگی کا اثرات غدر کے بعد صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں۔انقلاب کے بعد تیزی سے مغربی ممالک کے تہذیبی کلچرل اور ادبی اثرات ہندوستانی ذہنوں پر پڑنے لگے۔آزاد نے جو خود دلّی کالج کے طالب علم اور ذوق کے شاگرد رہ چکے تھے، نئے رجحانات سے آشنا ہوکر نئی اردو شاعری کا خاکہ بنایا اور اگست ۱۸۶۷ء میں اپنے رفقاء اور ہموطنوں کو ایک خطبہ دیتے ہوئے مشرقی شاعری، خاص کر اردو فارسی شاعری کے نقائص کی طرف توجہ دلائی اور پھر نئی شاعری اور نظم نگاری کی ترقی کے لیے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں لاکر موضوعی مشاعروں کا اہتمام کیا۔کرنل ہالرائڈ نے اس انجمن کی سرپرستی کی۔آٹھ مئی ۱۸۷۴ء کو لاہور میں وہ پہلا یادگار مشاعرہ ہوا جس میں نئے طرز کی نظمیں پڑھی گئیں۔پہلے مولانا آزاد نے ایک بہت عمدہ اور بے حد معلومات افزا خطبہ دیا اور پھر شاعری میں اصلیت سے کام لینے، مقامی رنگ پیدا کرنے اور زندگی کی سچی تصویر کشی کرنے کو کہا۔اس طرح اردو شعری روایت میں ایک نئے دور کا اضافہ ہوا۔حالی نے بھی ان موضوعاتی مشاعروں میں شرکت کی اور کئی موضوعاتی نظمیں لکھیں۔آزاد اور حالی کی ان کوششوں سے اردو شاعری کو روایتی تقلید کے دائرے سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔شاعری روایتی موضوعات سے آزاد ہوکر عام بول چال کی سطح پر جینے لگی۔یہ دور تہذیبی معاشرتی اور ادبی تغیرات اور روایت سے بغاوت کے بجائے اصلاحی دور تھا۔

ادب کو زندگی کے تناظر میں رکھ کر دونوں کے باہمی رشتوں پر غور کرنے کے زبردست رجحان کو باقاعدہ طور پر پروان چڑھانے میں سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک سے بڑی مدد ملی۔اس تحریک کو آگے بڑھانے میں حالی اور شبلی پیش پیش رہے۔لیکن اس اصلاحی تحریک کو جلد ہی ایک شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔سرسید کی انگریزوں سے قربت اور سائنسی نظریے کی وجہ سے لوگ کھل کر علی گڑھ تحریک کی مخالفت کرنے لگے۔جن میں اکبرالہ آبادی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ان کا نصب العین سرسید سے مختلف نہیں تھا،لیکن وہ اس طریقۂ کار کے شدید مخالف تھے۔اس مخالفت اور شدید عوامی ردِعمل نے انسانی سوچ کو پھر ایک نئی دنیا کی تلاش پر مجبور کیا اور رومانی رجحانات پرورش پانے لگے۔جبکہ انگلستان میں رومانی تحریک کلاسیکی شاعری کے خلاف ایک ردِعمل کے طور پر شروع ہوئی۔ اس میں اجتماعی تصورات کے بجائے انفرادیت اور داخلیت پر زور دیا گیا۔جس میں شعراء نے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے منہ موڑ لیا اور خوابوں کی دنیا میں اپنی من پسند دنیا بنانے لگے۔اردو شاعری میں یہ رجحان بھی عام ہوا۔رومانیت کے رجحان کو عام کرنے میں

اختر شیرانی اور عظمت اللہ خاں پیش پیش رہے۔اختر شیرانی کا طرز اظہار نوجوانوں میں بے حد مقبول رہا۔بیسویں صدی کے اوائل میں اسمٰعیل میرٹھی، شبلی، شوق قدوائی، وحیدالدین سلیم، نظم طباطبائی، سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، چکبست اور اکبر وغیرہ حالی اور آزاد کی پیروی کرتے رہے۔ان شعراء نے زیادہ تر ایسے موضوعات پر نظمیں لکھنا پسند کیا جن سے اخلاقی اصلاح ہو سکے یا جو عام لوگوں میں قومی جذبہ بیدار کر سکیں یا پھر ایسی نظمیں جن میں مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہو۔یہ دور بنیادی طور پر موضوعاتی شاعری کا دور تھا۔

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں سامنے آنے والے نظم نگاروں کی فہرست طویل ہے جن چند نظم نگاروں نے اس دور میں مقبولیت حاصل کی ان میں سب سے اہم نام اقبال کا ہے۔اقبال نے غالب کے داخلی اور تخلیقی پیرایۂ اظہار کی روایت کی توسیع کرتے ہوئے حالی اور آزاد کی تشکیل کردہ روایت کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔انھوں نے نئے موضوعات اور نظم کی ہیئت کو اپنانے کے ساتھ غزلیہ روایت کا بھی گہرا اثر قبول کیا۔چنانچہ انکا رشتہ اپنی شعری روایت سے مضبوط اور مستحکم ہے۔اقبال کی شاعری نے اردو میں پہلی بار قومی اور ملّی مسائل کو ان کے وسیع تر تناظر میں دیکھا اور اظہار اور بیان کی نئی نئی جہات ایجاد کیں۔ان کی مقبولیت عوام سے زیادہ خواص میں رہی۔ان کے انسانِ کامل کے تصور اور خودی کے فلسفے نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

اقبال نے نوجوانوں میں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا حوصلہ، محبت کو اپنا مسلک بنانے کا قرینہ اور مشکلات سے خوف زدہ نہ ہونے کا عرفان پیدا کیا۔مختصراً اقبال نے اردو نظم میں معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے اضافے کیے اور اس صنف کو نئے امکانات سے روشناس کیا۔اقبال نے اپنی شاعری سے اپنے عہد کے ساتھ ساتھ بعد کی نسل کو بھی متاثر کیا۔

اقبال کے علاوہ اس دور میں جن دوسرے شاعروں نے اردو نظم نگاری میں اہمت حاصل کی ان میں جوش، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور عظمت اللہ خاں نمایاں ہیں۔ان سب شعراء نے اردو نظم میں فکر وفن کے نئے تجربے کیے اور اپنے عہد کی نسل کو متاثر کیا۔

اس عہد میں اقبال کے بعد جوش کا ہی نام لیا جاسکتا ہے۔ان کی شاعری کے تین اہم موضوعات ہیں۔مناظر فطرت کی عکاسی، حسن وعشق کا بیان اور انقلاب۔ان تینوں موضوعات کے اظہار میں جوش کا اندازِ بیان جذباتی ہے۔وہ اقبال کی طرح موضوعات کی گہرائی میں اتر کر نہیں سوچتے، اگرچہ انھیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔وہ اردو میں ''ایجی ٹیشن'' شاعری کے موجد ہیں۔انقلابی نظموں میں ان کا لہجہ خطابت اور بلند آہنگی کا ہے۔ترقی پسند اردو نظم پر ان کے اس لہجہ کا پورا اثر پایا جاتا ہے۔

اس دور میں جن شعراء نے ہیئت واسلوب کے تجربے کئے ان میں سب سے خاص نام عظمت اللہ خاں کا ہے جو غزل کے متعلق اپنے باغیانہ تصور کے لئے مشہور ہیں۔ان کا خیال تھا کہ غزل کی گردن بلا تکلف ماردی جانی چاہیے۔لیکن ان کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے مغرب کی شاعری سے واقفیت کے سبب اردو نظم میں داخلی اور خارجی تنظیم کو بدلنے کی کوشش کی۔وہ عربی اور فارسی عروض کے بجائے ہندی پنگل سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔وہ نظم کو فارسی لفظیات اور لب ولہجہ سے الگ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔حفیظ جالندھری بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے ابتدا میں اچھی رومانی اور وطنی نظمیں کہیں، کچھ نظم نما گیت اور کچھ گیت نما

نظمیں لکھیں۔ساغر نظامی نے قوم پرستی کی چاشنی سے اپنی شاعری میں لذت پیدا کی۔

اس طرح آزاد اور حالی کی نیچرل شاعری کی اصلاحی تحریک سے لے کر ترقی پسند تحریک جس میں زندگی کے تمام تجربات پیش کیے گئے۔۱۹۳۵ء تک آتے آتے اردو شاعری اس قابل ہو چکی تھی کہ اس میں زندگی کا ہر تجربہ اور ہر خیال بیان کیا جا سکے۔اس دور کی شاعری کا اہم عنصر افادیت تھا۔یہ شاعری پر ادب برائے زندگی کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے۔

12.4 خلاصہ

اردو کی اہم ادبی تحریکات سرسید تحریک، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ ہیں۔کسی تحریک کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس تحریک کے پس منظر سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ہندوستان میں سیاسی سماجی اور قومی بیداری کا آغاز انیسویں صدی کی مذہبی اصلاحی تحریکوں سے ہوتا ہے۔معاشی و تہذیبی استحصال کے باوجود انگریزوں نے کچھ کام ایسے کیے جن کا نتیجہ ہندوستانیوں کے لیے مفید ثابت ہوا۔ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں نئے طرز کی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔انقلاب روس اور مزدوروں کی حکومت نے ہندوستان کو اشتراکیت اور رکمیونزم کے نزدیک لا دیا۔۱۹۱۷ء میں روس میں زبردست انقلاب آچکا تھا اور مزدوروں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔اس کے اثرات پوری دنیا نے قبول کیے۔ہندوستانی سیاست پر بھی اس کے اثرات پڑے اور کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی۔کانگریس کے اندر بھی جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس اشتراکیت سے متاثر ہوئے۔یورپ کے اقتصادی بحران، جرمن کی نازی حکومت کی تاناشاہی اور فاشزم کے بھیانک طوفان کی زد سے ادب اور تہذیب کو محفوظ رکھنے کی غرض سے دنیا بھر کے اشتراکی مصنّفین نے متحد ہو کر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔

12.5 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات تحریر کیجیے۔

(۱) ادب برائے زندگی کا نظریہ پیش کیجیے؟

(۲) ادب برائے سماج کا نظریہ واضح کیجیے؟

(۳) سرسید کی ادبی خدمات بیان کیجیے؟

(۴) ترقی پسند تحریک کی اہمیت بیان کیجیے؟

12.6 فرہنگ

الفاظ		معنی
بحران	:	ہلچل، بے چینی
پسماندگی	:	پچھڑا ہوا

تبلیغ : پہنچانا،

ترویج : رواج، شہرت

تسلط : غلبہ، قبضہ

تشکیل : شکل بنانا

جدلیاتی : کشمکش سے متعلق

خستہ حالی : شکستہ حالی

قیادت : رہبری، سرداری

کانفرنس : مشاورت کا جلسہ

12.7 شفارش کردہ کتابیں

1 ادب اور انقلاب: اختر حسین رائے پوری، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد

2 ادب اور زندگی: مجنوں گورکھپوری، اردو گھر علی گڑھ ۱۹۶۵ء

3 اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۸ء

4 ادبی رجحانات کا تجزیہ: راجندر ناتھ شیدا، آستانہ بک ڈپو، دہلی ۱۹۵۶ء

5 اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر: احسن فاروقی، آزاد کتاب گھر، دہلی

6 اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ ۱۹۹۶ء

7 افادی ادب: اختر انصاری، آزاد کتاب گھر، دہلی طبع چہارم ۱۹۵۹ء

8 ترقی پسند ادب: سردار جعفری، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۵۱ء

9 ادبی تحریکات۔۔۔ڈاکٹر ساجد علی قادری

☆☆☆☆☆☆☆☆

اکائی ۱۳ : جدیدیت کی تحریک

اکائی کے اجزاء

13.1 مقاصد
13.2 تمہید
13.3 موضوعات
13.3.1 جدیدیت سے کیا مراد ہے؟
13.3.1 جدیدیت کا آغاز
13.3.1 ترقی پسند تحریک اور جدیدیت
13.3.1 جدیدیت اور حلقۂ ارباب ذوق
13.3.1 جدیدیت کے اردو نثر پر اثرات
13.4 خلاصہ
13.5 نمونے کے امتحانی سوالات
13.6 فہرہنگ
13.7 شفارش کردہ کتابیں

13.1 مقاصد

☆ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء۔۔۔
☆ جدیدیت کی تعریف بیان کرسکیں گے۔
☆ جدیدیت کا آغاز کس طرح ہوا؟ یہ بتاءسکیں گے۔
☆ جدیدیت اور ترقی پسند تحریک سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ جدیدیت کے اردو نثر پر اثرات کس طرح مرتب ہوئے یہ بتاءسکیں گے۔

13.2 تمہید

ادب میں جدیدیت کسی باضابطہ تحریک لائحہ عمل یا منشور کے تابع نہیں بلکہ اس کی بنیاد انفرادی احساسات، تجربات کی حقیقت کے براہ راست تجزیہ کرنے اور برتنے کی انفرادی کوششوں پر ہے جدیدیت کسی ایک فکری دھارے کا نام نہیں بلکہ اس میں بہت سے

مختلف اور متضاد سمتوں میں بہتے ہوئے دھارے بھی شامل ہیں۔ جدیدیت ان سب کو قبول کرتی ہے۔ پہلے سے چلے آنے والی روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے بھی ہر زمانے کی جدیدیت روایت سے انحراف ہی کرتی ہے۔ اگر روایت سے انحراف کا عمل شروع نہ رہے تو پھر ہم جدیدیت کے لیے کوئی جواز نہیں پیش کر سکیں گے۔

13.3 موضوعات

13.3.1 جدیدیت سے کیا مراد ہے؟

جس وقت ہم جدیدیت پر گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ آئینہ صاف ہو جاتا ہے کہ آج کا ادب نہ صرف میرؔ اور سوداؔ کے عہد سے الگ ہیں بلکہ آج سے کچھ سال پہلے حقیقی زندگی کی عکاسی تھی۔ جدیدیت کی تعریف اس طرح سے کہ یہ اپنے وقت کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام مشکلات سے نکل کا نام ہے۔ ہر عہد میں جدیدیت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہوتی ہے اس لحاظ سے جدیدیت ایک ایسا عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ہر عہد میں ان لوگوں نے جو حقیقی طور پر زندہ رہے ہیں، اس پر عمل کیا ہے۔ انھوں نے فکر وفن کی سطح پر فرسودہ اقدار کے خلاف جنگ کر کے نئی قدروں کی پرورش کی اور عملی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے اسی مفہوم میں ادب کو روح عصر کہا جاتا ہے۔ اپنے زمانے میں ادیب جدید رہا ہے۔ لیکن غالبؔ کے عہد کی جدیدیت جن عناصر سے عبارت ہے، وہ مختلف ہیں اور ہمارے عہد کی جدیدیت کے عوامل مختلف ہیں اسی بناء پر ہم آج کے دور کی جدیدیت اور پچھلے دور کی جدیدیت میں فرق واضح کر سکتے ہیں یہی سبب ہے کہ ترقی پسند ادب سے بالکل الگ ہے۔ اس لیے اپنے عہد کی حقیقی زندگی اور اس کے مشکلات وامکانات کا سامنا کرنا ہی جدیدیت کہلا سکتا ہے۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا تعلق ہے وہ اپنے زمانے کی جدیدیت ہی کا اظہار تھی جب تک اس تحریک نے اپنے اندر الگ الگ رجحانات کو سموئے رکھا۔ مارکس اور فرائڈ دونوں کے اثرات اس میں نمایاں رہے۔ سماجی تبدیلیوں کی ضرورت کے ساتھ ساتھ ہیئت اور مواد میں نئے تجربوں پر بھی زور دیا گیا۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ تحریک دو مختلف حلقوں میں تقسیم ہو گئی۔ وہ حلقہ جو سماجی تبدیلی پر زیادہ زور دیتا تھا، سیاست کا اہم رکن بن گیا اس نے شعور کو فن، پر سماجی اقدار کو جمالیاتی اقدار پر اور مواد کو ہیئت پر اولین پر ترجیح دی۔ دوسرا حلقہ افرائیڈ کے زیر نئے تجربات، انفرادیت، داخلیت اور موضوعیت کے نام پر سماجی مسائل سے دور ہو گیا۔ دونوں حلقوں نے اپنا وجود کھو دیا تھا۔ کیوں کہ دونوں کے مناسب اور متوازن امتزاج ہی سے جدیدیت کی صحیح تشکیل ہو سکتی تھی۔ پہلا حلقہ ترقی پسند تحریک کے آخری دور میں غالب کار ہا اور دوسرا حلقہ میراجی (حلقہ ارباب ذوق) اور ہیئت پرستوں کے ہاتھوں ابلاغ پر ابہام کو اور فن کو زندگی پر ترجیح دینے لگا۔ دونوں ہی افراط وتفریط کا شکار ہو گئے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آج کی جدیدیت اس دوسرے حلقے کی ہی توسیع ہے۔ مگر ادب میں جدیدیت دونوں ہی حلقوں اندر سموئی نظر آتی ہے۔

13.2.1 جدیدیت کا آغاز

اس تعلق سے ہم صرف اتنا ہی کہے سکتے ہیں کہ کسی بھی تحریک کا سلسلہ کو کسی حتمی سن اور تاریخ میں تعین کرنا ممکن نہیں ہے ایسا ہوتا

بھی نہیں ہے کہ کوئی بھی تحریک یا رجحان اچانک شروع ہوتا ہے نہ ختم ہو۔ ۱۹۵۵ء کے آس پاس جب سماجی تہذیبی اور خارجی رشتوں کی شکست وریخت کا دور شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ ترقی پسندی اپنی متعین راہوں سے گریز کرنے لگی تو نئی نسل میں بے چینی اور اضطراب بڑھنے لگا اور جدیدیت کے اسباب کی تخم ریزی ہونے لگی۔ 'جدیدیت' اصطلاحی شکل میں اردو میں کافی بعد میں استعمال ہونا شروع ہوا جب کہ عالمی سطح پر اس کے زوال کا زمانہ، چوتھی اور پانچویں دہائی تھی۔ اردو ادب میں اس کی شروعات لگ بھگ ۱۹۶۰ء کے آس پاس منظور کی جاتی ہے۔ ویسے ۱۹۵۵ء کو ایسا خط تنصیف مان سکتے ہیں، جب ایک طرف اردو کی کامیاب ترین تحریک ترقی پسند زوال پذیر ہونے لگی تھی۔ اور جدیدیت کے تازہ اور نرم روجھونکے نئی نسل کے ذہنوں کی آبیاری کرنے لگے تھے۔

اردو ادب کی ہمہ جہت فروغ میں سب سے طاقتور کردار ادا کرنے والی تحریک، جسے ہم ترقی پسند تحریک کے نام سے جانتے ہیں ۱۹۳۰ء سے شروع ہونے والی یہ تحریک اپنے عروج پر ہی تھی کہ تقسیم کا کرب انگیز سانحہ رونما ہوا۔ موضوعات ہیں ہجرت، درد وکرب، پناہ گزیں کیمپوں کی روداد اور دیگر لفظ شامل ہوتے گئے۔ حالات سنبھلے اور دوبارہ بسنے میں کئی برس لگے اردو ادب ترقی پسند تحریک تقسیم کے المیے بیان کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اجتماعیت اپنا اثر کھونے لگی انسان خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ ایسے میں ادیب وشاعر ترقی پسندی کے خول میں گھبراہٹ اور اکتاہٹ کا احساس کرنے لگے، جنگ، امن، انقلاب، معاہدہ جیسے الفاظ ذہنوں پر بوجھ بنتے گئے۔ خارجی عوامل انسان کے باطن کو بے چین کرنے لگے۔ اکتاہٹ، اجنبیت غیرہ مانوسیت بے چینی و بے قراری انقلاب آفرین نعروں کی گھٹن اور حبس بے جا کے شکنجے میں مقید فرد کی فردیت اور اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔ دوسری طرف ہر الّم غلّم تحریر کو ادب کا نام دیا جانے لگا۔ ان حالات میں نئی نسل کے ذہن میں روایت سے انحراف کے جراثم کلبلانے لگے ایک ایسے ادبی رجحان کی تلاش شروع ہوئی جس میں فرد کی فردیت کو اولیت حاصل ہو جس میں خارجی عوامل کے اثرات سے انسان کے اندرون کا اظہار بھی ہو۔ جس میں نعرہ بازی کوئی فارمولا، کوئی منشور نہ ہو، تخلیق کار آزاد ہو، اس کا ذہن ہر ''دباؤ'' سے پاک ہو۔ نئی نسل کی اس خواہش کے عین مطابق جدیدیت کا رجحان سامنے آیا جدیدیت نے شروع سے ہی اپنا اثر ادب پر ہوتا مخصوص انداز میں بکھیرنے لگا۔

☆ **جدیدیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے وفیسر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:**

''جدیدیت لفظ جدید سے مشتق ایک ادبی اصطلاح ہے جس نے ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد اردو میں ایک ہم گیر ادبی تحریک کی حیثیت حاصل کی ترقی پسند تحریک کی سرمایہ دارانہ جبر واستحصال کے خلاف ایک اجتماعی بغاوت تھی جدیدیت سماجی اور میکانکی جبریت کے خلاف ایک باغیانہ ردعمل ہے۔''

پروفیسر لطف الرحمٰن اپنے مضمون ''جدیدیت کا آغاز'' میں آگے چل کر جدیدیت کو عالمی تحریک وجودیت (فلسفہ وجودیت) کو ہی توسیع مانتے ہیں۔ وجودیت جس کا بنیادی موضوع وفضلیت اور انفرادیت تھا۔ جو جدیدیت کا بھی موضوع ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''جدیدیت فرد کی داخلی جلاوطنی وموضوعی بے پناہی کی ترجمانی وتنقید ہے جس کے نتیجے میں فرد تنہائی، الجھن، بے گانگی، اجنبت، اکیلا پن، کلبست، جرم، بے خوفی، بے سمتی، بے یقینی ناامیدی، بے تابی، اکتاہٹ، بیزاری اور متلی کی کیفیت سے دوچار ہے ان رجحانات کے اعتبار سے جدیدیت فلسفہ وجودیت کی توسیع ہے۔''

یہ بات ہم نے تسلیم کرنا چاہے کہ کہ جدیدیت کے رجحان کا فروغ ۱۹۶۰ء کے آس پاس میں ہوا۔لیکن اسی سلسلے میں ایک دو قابل غور بات یہ ہے کہ ہمارے بعض ادیب،نقاد،حضرات اس بات سے متفق نہیں ہیں۔

جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں جہاں دوسرے باب کارفرما تھے وہیں اردو کے کچھ رسائل بھی تھے جنھوں نے اس رجحان کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس ضمن میں سب سے نمایاں حیثیت شمس الرحمٰن فاروقی کی نگرانی میں شائع ہونے والی ''شب خون'' کی ہے۔جس نے مسلسل جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے کی کوشش کی اور اسے ایک مشن کے طور پر اپنایا زیادہ تر ایسی ہی تخلیقات کو شائع کیا اور نئے افسانہ نگاروں،شاعروں کو ایسا ادب لکھنے کی تلقین کی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں ''شب خون'' نے ایک ادارے کا کردار کیا اور اردو تحریکات کی تاریخ میں نئی تاریخ رقم کی لیکن جدیدیت کے معنی پہلوؤں کو عام کرنے کا سہرا بھی ''شب خون'' کے ہی سر ہیں۔جدیدیت کے رجحان نے شدت اختیار کرنے میں بھی شب خون کی بیساکھیوں کا سہارا لیا۔

13.2.2 جدیدیت اور ترقی پسند تحریک

اردو میں ترقی پسند نظریہ کی تحریک خاص طور پر دو ہندوستانی نوجوانوں کے سوشلزم سے متاثر ذہنوں کی اختراع تھی جو لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔اس طرح سرمایہ دارانہ نظامِ سیاست سے ان کو نفرت اور کارل مارکس کے اقتصادی فلسفے کی بنیاد پر روس میں قائم ہونے والے اشتراکی سماج سے ان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔اس تحریک کے قائد سجاد ظہیر نے اپنی ڈائری میں اس وقت کی ذہنی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:''ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے میں مدد دے سکے اس ذہن کے ساتھ ترقی پسند ادب کا لائحہ کار طے کیا گیا لازماً اس کی بنیاد عوامی اور اجتماعی زندگی کی ترجمانی پر رکھی گئی یعنی ادب یہ عوام کا ترجمان ہوتا ہے۔اس بناء پر اردو ادب کی خصوصات بیان کی گئی ہے۔''ایک یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔''

ترقی پسندی کی دوسری بنیاد اجتماعیت تھی چونکہ اشتراکیت افراد کی جداگانہ شخصیت کی قائل نہیں۔اس لیے ادیب یا شاعر کی انفرادیت اور ذاتی احساس کی ادب میں گنجائش نہیں۔اس لیے بھی کہ شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات کے لیے عوام ہی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

اس کی تیسری بنیاد ادب اور سیاست کے درمیان گہرے رشتہ پر تھی۔دوسرے لفظوں میں یہ ادبی تحریک جماعتی سیاست کی پابند تھی اس کی چوتھی بنیاد سائنسی عقلیت پر تھی۔یعنی زندگی کے مختلف مسائل کے سلسلے میں ان کا انداز نظر سائنسی ترقی پسندانہ اور مادیت پرستانہ ہوگا۔اس طرح اگر مادیت پرستی کو بھی بنیادی قدر مان کر چلیں تو ترقی پسند تحریک کی فکری بنیادیں اشتراکیت،اجتماعیت،جماعتی، سیاست،سائنسی عقلیت سے بالکل نزدیک تھی۔

درج ذیل باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پسندی اپنے وسیع تر مفہوم میں جدیدیت ہی کے کی نشان دہی کرتی ہے اگر

ترقی پسندی میں سے سیاسی انتہا پسندی کو نکال دیا جائے اور جدیدیت میں سیاسی سماجی شعور کو ممنوعات میں داخل نہ کیا جائے تو ان دونوں میں کوئی فرق بھی نہیں پایا جاتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ادب میں ترقی پسند کی اصطلاح ادبی کم اور سیاسی زیادہ رہے۔ اس لیے یہ مشکل پیدا ہوتی ہے۔ آج کے زمانے میں مذہب کی جگہ سیاست نے اپنالی ہے۔ مذہب اور سیاست کا مشترکہ جبر آزاد خیالی، ترقی پذیری، جرات فکر وعمل نئی اقدار کی تشکیل اور انفرادی احساسات کے اظہار پر پابندی لگانا چاہتا ہے اس لیے دونوں کا جدیدیت سے تصادم گریز ہے۔ اس تصادم کے نتیجے میں ادب سیاست کی دنیا میں دخل دینے پر مجبور ہے۔ جدید ادب بھی سیاسی مسائل پر سوچتا اور لکھتا ہے مگر ادب میں سیاست کو ہمیشہ ثانوی حیثیت حاصل رہے گی جدید ادب کے نزدیک ادب کا مقصد ''ادب برائے ادب'' ہے فنی اور جمالیاتی اقدار کو ادب میں اولیت حاصل ہونی چاہیے۔ ''جدیدیت'' ادب کے اس عرفان کے ساتھ یقیناً ترقی پسندی سے اگلا قدم ہوگا کہ یہ اس کے ایک رخ پن سے انحراف کر کے اس کی صحت مند روایت کی توسیع کرتی ہے۔ ترقی پسندی نے فرد پر سماج کو اور انفرادی احساس پر اجتماعی شعور کو اس قدر غالب کر دیا تھا کہ ادب میں اس کے خلاف ردعمل ہونا ضروری اور فطری تھا۔ جدیدیت اس ردعمل کے اظہار سے ہمارے ادب کا نیا رجحان بن کر سامنے آئی جدیدیت نہ صرف ترقی پسندی کی بہترین روایات کی نگہ دار ہے بلکہ تمام کلاسیکی ادب کی زندہ روایات کی وارث بھی ہے۔

13.2.3 جدیت اور حلقہ اربابِ ذوق

ترقی پسند تحریک کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد ہی محسوس کیا جانے لگا تھا کہ ترقی پسندی کا حقیقت نگاری کا تصور ناکافی ہے شخصی آزادی اور قوت تخیل کو خارجی دباؤ سے آزاد رہنا چاہیے موضوعات کے لیے شاعر کو پابند نہیں کیا جاسکتا۔ ادیبوں کے لیے کسی تنظیم یا جماعت سازی کی ضرورت نہیں حسن اور جنس کو شعر وادب میں پیش کرنا گناہ نہیں شاعری راست بیانی نہیں۔ جماعتی ادب میں پروپیگنڈہ زیادہ ہوتا ہے ادب کم ہوتا ہے۔ اس تصور کے ادیبوں اور شاعروں کو ترقی پسندوں ہندوؤں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا نتیجہ میں آہستہ آہستہ وہ اس سے دور ہوتے گئے۔ اور لاہور میں قائم حلقہ ارباب ذوق سے متعلق ہوتے گئے۔ ''حلقۂ ارباب ذوق'' ابتدا میں 'بزم داستاں گویاں' کے نام سے مشہور تھا ۱۹۳۹ء میں لاہور میں سید نصیر احمد شاہ کے مکان پر چند ادیب جمع ہوئے اور ایک ادبی محفل بنائی اس کا نام ''بزم داستاں گویاں'' تھا۔ ابتدا میں اس کا دائرہ صرف افسانوں تک محدود تھا۔ بعد میں شعر کو بھی تنقید کی زد میں آنا پڑا۔ درحقیقت حلقہ ارباب ذوق کی شعری شناخت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے میراجی نے اس کی رہنمائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ اس سے پہلے حلقہ ارباب ذوق کی صرف اتنی شناخت تھی کہ اس سے متعلق ادیب جماعتی پابندیوں سے آزاد ادب پر زور دینے کے قائل تھے۔ مگر جب ۱۹۴۶ء میں ''ادب کیا ہے اور کیسا ہونا چاہیے۔'' تو بحث چھڑی تو یہ ظاہر ہوتا گیا کہ اس حلقے کا محور صرف ادب ہے۔ اور یہ کسی اصلاح تبلیغ یا آموز کا لیبل لگانے کے لیے تیار نہیں اس لیے ترقی پسند نظریات سے متاثر شعرا اور ادبا اس سے الگ ہوگئے اور میراجی اس حلقے کے روح رواں بن گئے۔

ترقی پسندی کے زوال کے بعد جب جدید تر شاعری اور افسانوی ادب کے قوی رجحان نے اس حلقہ کی روایتوں کو اور آگے بڑھا کر اس کو روشن کیا تو اس حلقہ کے اثرات کا اندازہ ہوا۔ اصطلاحی معنوں میں یہ انفرادیت پسندی اور علامت نگاری کا ایک قوی

رجحان تھا۔ جس کی اس حلقے نے پرورش کی۔ اس جماعت کے جو بلا واسطہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی ادب کے پرکھنے کے لیے جدید زاویہ اختیار کیا۔ جدید نظم پر افسانہ اور جدید تنقید کو خالص ادبی یا نفسیاتی نقطہ نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوششیں کی جانے لگیں اور بے شمار ایسے شاعر اسی جماعت کے ہفتہ وار جلسوں کے ذریعہ متعارف ہوئے۔ جو آج مسلّم رتبے کے حامل ہیں۔

اس طرح ''حلقۂ ارباب ذوق'' نے اردو شعر وادب میں ایک ایسے رجحان کی پرورش کی جس کی بنیاد پر جدید یا نئی شاعری کا قوی رجحان پیدا ہوا۔ اس نے ادب کو انسانی شخصیت کا مرکز بنانے پر زور دیا نتیجہ میں اس کی نشستوں کے مباحث بھی کسی مخصوص دائرے میں محدود نہ تھے۔ ان کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ ادب کو غیر ادبی مقاصد سے الگ کر کے ایک مقصود بالذات تہذیبی خطر بنا دیا جائے اس کی سب بڑی خدمت بقول ڈاکٹر شمیم حنفی کے یہ تھی کہ ''اس نے ادب کو سیاسی اور اخلاقی آمریت سے نجات دلائی۔'' اور بقول راشد ''ادیبوں اور شاعروں کو ان غیر ادبی گروہوں کے غلبے سے بچایا جو قاری کی عام انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے مخصوصی یا سیاسی نظریات کا غلام بنانا چاہتے تھے۔ ۱۹۵۹ء تک حلقے کو نشستیں باقاعدگی سے منعقد ہوتی رہیں ۱۹۷۹ء تک حلقے کا وجود کسی نہ کسی نوع سے باقی تھا۔ مگر بہر حال یہ طے ہے کہ اب یہ حلقہ فعال نہیں رہا۔

اس طرح جدیدیت کی بنیاد انفرادی احساسات تجربات اور عصری حقائق کو براہ راست تخلیقی سطح پر برتنے کی کوششوں پر ہے غور سے دیکھا جائے تو اس میں مختلف سمتوں کے فکری دھارے آ کر جدیدیت یا نیا پن کے ایک بڑے دھارے میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس میں میراجی کے اثر سے ہندو دیومالائیت بھی در آئی ہے اقبالؔ کے زیر اثر اسلامی عقائد اور تہذیبی اثرات کا عمل دخل بھی ہے۔ اس تحریک میں نفسیاتی، جنسی، نیم شعوری اور لاشعوری کیفیات کی بھی بازگشت سنائی دی۔ مغرب کی علامت نگاری سررئیلزم اور ڈاڈاازم کی پیروی کا بھی انداز ہے۔ اور ژاںؔ پال سارتر کے فلسفہ وجودیت کی خود بینی اور خود پسندی کی کیفیت بھی ہے۔ ان سارے فکری دھاروں سے مل کر نیا پن کا جو ڈھانچہ بنایا ہے وہ اپنے پہلے شعری رویے سے نمایاں طور پر مختلف ہے اس کے باوجود اس میں پیشتر شاعری کے کئی رنگ گھل مل کر جدید رنگ ہو گئے ہیں **ڈاکٹر شمیم حنفی کے بقول**:

> ''جدیدیت عصریت نہیں ہے بلکہ عصری سچائیوں کی بنیاد پر تاریخ اور تہذیب کے پورے سرمائے اور انسان کے ذہنی اور جذباتی مسائل کی دائم واقعات وحقیقت کو نئے اور تازہ کار زاویوں سے دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ اس میں اظہار وافکار کی انقلاب آفریں تبدیلیوں کے باوجود نئی شاعری میں پیشرو شاعری کے کئی رنگوں کا طلسم کارفرما نظر آتا ہے اور ان مسائل ومعاملات کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جو نئی شاعری کے آغاز سے پہلے بھی شعرا کی فکر ونظر کا مرکز بن چکے تھے۔

13.2.4 اردو نثر اور جدیدیت

کرشن چندر کی ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' میرزا ادیب کا ''درون تیرگی'' منٹو کا ''پھندنے'' قرۃ العین حیدر کا ''پت جھڑ کی آواز'' اور شیشے کا گھر ''ممتاز شیریں کا'' ''دیپک راگ'' اور میگھ ملہار'' اور ''انگارے'' کے بھی دو ایک افسانے آج کے معنوں میں تجریدی اور علامتی تو نہیں ہیں مذکورہ بالا افسانے بھی علامت اور تجریدیت کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ''کفن'' کے خاتمے پر

''انگارے'' دیکھے اور ''انگارے'' کے بجھنے پر نئے افسانوں نے جنم لیا۔مثلاً ''پھندنے'' میں کوٹھی کی ملازمہ جو بقول منٹو اپنے جسم کو تو کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی اور آخر میں چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا کر دے۔مجبور ہو کر گلے کے ازار بند نما گلو بند کو تنگ کر کے خودکشی کر لیتی ہے۔سلام بن رزّاق کا افسانہ ''دوسرا قتل'' اس کا ثبوت ہے۔شنکر اپادھیایے اپنے معاشرے سے متاثر ہو کر اپنے دوست کی بیوی کو عشق کے جال میں پھنسا کر اور اسی کی مدد سے اپنے دوست سریش کو قتل کر کے اس کی بے پناہ دولت حاصل کر لیتا ہو۔لیکن ضمیر کے کچوکوں پر اس کا ردعمل کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔

13.3 خلاصہ

جدیدیت کی وجہ سے ہر طرف تبدیلیاں رونما ہوگی۔ہدیت نے آزادی اظہار پر زور دے کر ادب میں نئی فکر و احساس اور ایک نئی طرز کو ادب میں رائج کیا لیکن اس آزادی کا غلط استعمال بھی کیا جانے لگا۔جس سے بہت سی غیر ادبی چیزیں ادب میں داخل ہو گئیں۔ آگے چل کر جدیدیت نے بھی اپنے آپ کو چند چیزوں تک محدود کر لیا۔جدیدیت ہو یا ترقی پسندی دونوں کے زیر اثر اچھے ادب کی تخلیق بھی ہوئی ہے اور اس کے ادب پر منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔اس لیے جدیدیت کے منفی اثرات کے ساتھ ساتھ اس کے مثبت اثرات بھی ہمارے نظر کے سامنے دیکھائی دیتے ہیں۔اس وقت زندگی کی رمق اگر ہے تو میں کہ نئی پیڑھی کے شاعر اور افسانہ نگار کے سماجی بیگانگی، داخلیت، شکست ذات اور لایعنیت سے اوب چکے ہیں اور اس حصار سے باہر نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا اور زندگی کے نئے مسائل سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔آج جو کچھ بھی تبدیلیاں واقع ہو رہے اس کا خالص وہ صرف اور صرف جدیدیت کی وجہ سے رونماء ہو رہے۔

منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن'' کے خاتمے پر نئے افسانوں نے جنم لیا۔حالات اور اثرات نے نئی شاعری بنائی۔سریندر پرکاش نے جدید انسان کے ذہنی مسائل کو اپنا نشانہ بنایا، منٹو کا فن اور انتظار حسین نے داستانوں کرداروں اور دیومالائی علامتوں سے افسانوں کو نئے زمانے سے ہم آہنگ کیا۔بعض ایسے بھی افسانے ہیں جن لسانی تجربے نے نظم و نثر کی حدیں کو ملا دیں۔

ادب میں جدیدیت کسی کی تابع نہیں بلکہ اس کی بنیاد انفرادی احساسات، تجربات اور ہم عصر حقیقت کے براہ راست تجربہ کرنے اور برتنے کی انفرادی کوششوں پر ہے۔جدیدیت کسی ایک فکر پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے مختلف اور تضاد سمتوں میں بہنے والے دھارے بھی شامل ہیں جدیدیت سب کو قبول کرتی ہے۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا متعلق ہے وہ اپنے زمانے کی جدیدیت ہی کا اظہار تھی۔آہستہ آہستہ یہ تحریک دو مختلف حلقوں میں تقسیم ہو گئی۔پہلا حلقہ ترقی پسند کے آخری دور میں غالب کا رہا ہے اور دگر حلقہ ارباب ذوق میں تقسیم ہو گیا۔دونوں کے مناسب اور متوازن امتزاج سے ہی جدیدیت کی تشکیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس میں سائنسی، صنعتی، اور سماجی رجحانات بھی شامل ہو ہے ہیں۔ترقی پسند تحریک کا اثر جدیدیت پر پڑا ہے۔اسی طرح ساتھ اردو ادب پر بھی اس کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔

13.5 نمونے کے امتحانی سوالات

۱) جدیدیت سے کیا مراد ہے؟ مع مثال پیش کیجیے۔

۲) ترقی پسند دور میں جدیدیت کا رجحان کس طرح رونماء ہوا؟

۳) جدیدیت سے اردو ادب پر کون سے اثرات مرتب ہوئے؟

۴) ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے درمیان فرق واضح کیجیے؟

13.6 فرہنگ

الفاظ		معنی
خارجیت	:	ظاہری کیفیت
داخلیت	:	باطنی کیفیت
روحانیت	:	روحی قوت
علامت	:	نشان، آثار
تجرید	:	تنہائی، علیحدگی
اذیت	:	تکلیف
عصری	:	زمانے سے متعلق
حسیت	:	آگاہی، ادراک
مبہم کیفیات	:	غیر واضح
استعارہ	:	مشبہ
تمثیل	:	مشابہت
اعتدال	:	میانہ روی
تبلیغ	:	پہنچانا،
ترویج	:	رواج، شہرت

13.7 شفارش کردہ کتابیں

۱۔ جدید اردو تنقید اصول ونظریات: شارب ردولوی، نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۶ء

۲۔ جدید اردو شاعری: عبدالقادر سروری، آزاد بک ڈپو، امرتسر ۱۹۴۵ء

۳۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات: ڈاکٹر حامدی کاشمیری، مجلس اشاعت ادب، دہلی ۱۹۶۸ء

۴۔ جدید اردو نظم نظریہ وعمل: عقیل احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۰ء

۵۔ جدید شاعری: عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۳ء

۶۔ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس: شمیم حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۷۷ء

۷۔ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر سُنبل نگار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۳ء

۸۔ ترقی پسند ادب: علی سردار جعفری۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ بار دوم ۱۹۵۷ء

۹۔ ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ: ڈاکٹر شہناز احمد۔ ایجوکیشنل بُک ہاؤس ۲۰۰۹ء

۱۰۔ ادبی تحریکات ورجحانات۔۔۔۔ڈاکٹر ساجد علی قادری